قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

عالمی اردو کانفرنس

عالمی اردو کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:4، اپریل 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : شاداب شمیم، ثاقب فریدی، فیضان الحق

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

- عالمی اردو کانفرنس — ادارہ 7

زبان و تعلیم

- قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی — محمد معمور علی 19

ادب زاویے اور جہات

- ادب پر اساطیر اور مہماتی قصوں کا اطلاق — ناز قادری 23
- اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ — ابوبکر عباد 28
- پنچ تنتر کے اردو تراجم — سید اسرار الحق سبیلی 32
- اردو ادب میں تنقیدی نظریات ور جحانات — محمد خواجہ مخدوم محی الدین 34

شخصیات

- ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی — محمد الیاس الاعظمی 38
- اردو کا 'نندلال'... — شفیع ایوب 42
- جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی اور ان کی غزلیہ شاعری — فیضان حیدر 45
- رفعت سروش: جن کی آواز ریڈیو کی شناخت بن گئی تھی — ایم اے کنول جعفری 48

کتاب دریچہ

- جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — رفیع الدین ناصر 50

یاد رفتگاں

- تابش مہدی 'تعبیر' سے 'غزل خوانی نہیں جاتی' تک — منور حسن کمال 53

- ڈاکٹر تابش مہدی — ابوالبشر 56
- پروفیسر انور ظہیر انصاری — عبدالرحمٰن فیصل 59

خصوصی گفتگو

- غلام حیدر نقوی سے گفتگو — ساجد جلال پوری 63

نیا آسماں نئے ستارے

- اردو اور بھوجپوری کا رشتہ — پرواز احمد 66

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 69

خبر نامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 77

ہماری بات

ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی میں زبان و ادب کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ زبان و ادب کے ذریعے ہی ہم اپنے تاریخی، سماجی وقوعات اور تہذیبی بیانیے کا تحفظ کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے ہمارے اجتماعی احساس و ادراک کو ایک نئی سمت ملتی ہے۔ دراصل زبان و ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہی ہمارا اجتماعی شناخت نامہ ہے اور یہی ہمارے تہذیبی، لسانی اور قومی تشخص کا مظہر بھی۔ زبان و ادب کے ذریعے ہی ہم ملک کے معاصر مسائل و موضوعات کی ترسیل عوام تک کر پاتے ہیں اور ذہن سازی کی راہ بھی اسی سے ہموار ہوتی ہے۔ اگر زبان و ادب نہ ہوں تو شاید

ہماری تہذیب و تاریخ دشت فراموشی میں گم ہو جائے گی اور ہماری قومی اور ملکی شناخت کے سارے نشانات محو ہو جائیں گے۔ زبان و ادب نے ہی ہمارے اجتماعی اقدار و افکار کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اسی کے ذریعے ہم مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے مربوط ہو پاتے ہیں۔

ہندوستان ایک کثیر لسانی اور تہذیبی ملک ہے۔ یہاں مختلف زبانیں اور بولیاں ہیں اور ساتھ ہی الگ الگ ثقافتیں بھی۔ ان زبانوں اور ثقافتوں کا ادراک و اظہار زبان و ادب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں اور ادبیات سے تعلق رکھنے والے فنکاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہی ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا ایک واضح اور جامع تصور پیش کیا ہے۔ ادبیات نے ہی اپنے ملک کے Cultural Ethos اور مٹی کی پہچان کے تمام حوالوں کو زندہ بھی رکھا ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں نے اپنے قلم کو مشعل بنا کر تاریک راہوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے قلم کے ذریعے ہندوستان کی دھرتی کو محبت، امن اور رواداری کا پیغام بھی دیا ہے اور ان تمام مسائل پر بات کی ہے جو ہمارے ملک سے جڑے ہوئے ہیں۔

وکست بھارت کا وژن بھی اسی موضوعاتی سلسلے سے جڑا ہوا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسے ملک کا تصور ہے جو اقتصادی طور پر مضبوط اور ثقافتی اعتبار سے متحرک اور فعال ہو۔ وکست بھارت کا خواب ایک قومی مشن ہے جسے پورا کرنے کے لیے تمام شعبوں، نجی اداروں اور افراد کی کوششوں کی ضرورت ہے۔

عزت مآب وزیر اعظم نریندر مودی جی کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جہاں ہندوستان کی دوسری زبانیں مثبت اور فعال کردار ادا کر رہی ہیں، وہیں اردو زبان کا کردار بھی اس تعلق سے بہت اہم ہے کہ ماضی میں بھی ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اردو زبان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی سیاست ہو یا سماج، اسے مثبت اور صحت مند رخ دینے میں اس زبان کا رول ناقابل فراموش ہے۔ اس زبان نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا اور وکست بھارت کے وژن کو Fulfill کرنے میں بھی یقینی طور پر یہ زبان اپنے ماضی کے کردار کو دہرائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان جوش، جذبہ اور جنون کے ساتھ آگے بڑھ کر وکست بھارت کے وژن اور مشن سے جڑیں گے تو ہمارے ملک کی تقدیر و تصویر دونوں بدل جائے گی۔

قومی اردو کونسل نے اسی وژن اور مشن کی مقصدیت اور اہمیت سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے ایک عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا اور ان موضوعات و مسائل پر کانفرنس کو مرکوز رکھا جس سے وکست بھارت کے وژن کو ایک نیا تحرک اور تحریک ملے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سہ روزہ کانفرنس میں ارباب علم و دانش نے وکست بھارت کے تعلق سے بہت سے اہم نکات اور اشارات پر گفتگو کی جس سے یقیناً ہمیں وکست بھارت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد ملے گی۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ 2025 کا شمارہ اپنی تمام تخلیقی باریک بینیوں اور فکری جودتوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ ممنونم مشکورم! ادب کی افادیت اور ادب کی قرأت کے حوالے سے پرمغز اداریہ 'ہماری بات' کے تحت مطالعے کی اہمیت پر مبنی دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ 'ادب زاویے اور جہات' اردو میں وقت کے تصور کے حوالے سے وقت پر بڑی نہایت عمدہ و فلسفیانہ بحث فلموں اور نغموں کے تعلق سے کی گئی ہے۔ مختلف مذاہب، فلسفوں اور سائنس کے نظریات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، نیز مصر قدیم، قدیم ہند و فلسفے، افلاطون، ارسطو، اگسٹائن، آئن اسٹائن، اسٹیفن ہاکنگ اور یہودی، پارسی و اسلامی

نظریات سے بحث و استفادہ کیا گیا ہے۔ شاعری کے حوالے سے جاوید اختر، ن م راشد، اختر الایمان، ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں نقل کی گئی ہیں، نیز فکشن میں مبنی بر وقت تخلیقات خصوصاً عصمت چغتائی، کرشن چندر، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر جیسی نابغۂ روزگار فکشن نگاروں کے فکشن سے وقت کے فلسفیانہ تصورات کی وضاحت بحسن و خوبی کی گئی ہے۔ نصیب علی چودھری کا مضمون مراثی کی تلمیحات جدید فکر اور جدت طبع کا استعارہ ہے۔ عمیر منظر کا مضمون 'حاشیائی اردو خاکے' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ محمد شہباز عالم کا مضمون تحقیقی کاوشوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں عالمی کتاب میلے کی رپورتنگ بھی شامل ہے۔ مجاز کی نظموں کا صوتی آہنگ بے حد معلوماتی ہے۔ صوتی آہنگ کے حوالے سے علم العروض و بلاغت و صنعتوں کی رعایت سے خاطر خواہ بحث کی گئی ہے جس سے واقفیت طلبا و طالبات کی اہم ضرورت ہے۔ جمیل مظہری کی شاعرانہ خصوصیات، ہوش صاحب، مسلم انصاری، قدیم مذہبی کتب خانے جیسے مضامین تحقیقی کاوشوں کا ثمر ہیں، لوک گیتوں کی زبان اور لوک ادب میں لوری کی اہمیت منفرد فکر کی آبیاری کررہے ہیں۔ جدید ہندی شاعری میں اردو کی علامتوں اور شعری روایات کا استعمال ہندی اور اردو کی باہمی الفت کا حسین امتزاج ہے۔ پروفیسر قیصر شمیم، نواب محمد عبدالوحید، اردو تنقید کے مسائل، علاج بذریعہ غذا، ہیمنگوے، فراق شناسی، تبصرہ و تعارف اردو دنیا کی خبریں کافی اہم ہیں۔ غرض یہ کہ جدید اردو تعلیمی نصاب کے اہم ترین تقاضوں کی وضاحت نیز موجودہ عہد کی ادبی و تحقیقی سرگرمیوں کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ اس رسالے کے لیے نیک خواہشات۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم، صدر شعبۂ اردو، لائبریری کوآرڈی نیٹر، جمشید پور ومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

رسالہ 'اردو دنیا' کا شمارہ 2 فروری 2025 موصول ہوا۔ اس کا سرورق، پرکشش تصویریں، عمدہ کاغذ اور نفیس چھپائی ادارے کے اراکین کے ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ رسالہ دیکھ کر محسوس ہوا کہ رسالہ 'اردو دنیا' اردو ادب کو آفاقی موضوعات اور دریافت کے نئے گوشوں سے روشناس کرانے کا فریضہ بخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالمی سطح پر سائنس اور ٹکنالوجی کے باعث جو ذہنی، نظری، اور فکری تبدیلیاں آئیں اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آرہے ہیں اور اس بات کی غمازت شمس اقبال صاحب کا اداریہ بھی ہے۔ جس میں شمس اقبال صاحب لکھتے ہیں 'آج کے عہد میں ہم سب اپنی فکر کا سلسلہ سائنس اور تکنیک سے جوڑنے پر مجبور ہیں'۔ انھوں نے خاص طور پر ایک نئی ٹکنالوجی مصنوعی ذہانت (اے آئی) پر گفتگو کی اور اس کو زبان وادب سے جوڑنے پر زور دیا تاکہ ہماری زبان و ادب اور اس کے متعلقات کو فائدہ مل سکے اور اجنبی ملکوں کی تہذیب و معاشرت سے آگاہی ہو سکے اور جس طرح ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ڈیجیٹلائزیشن پر کام ہو رہا ہے وہاں اردو پیچھے نہ رہ جائے بلکہ زمانہ سے قدم سے قدم ملاکر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

دیگر شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی زبان و تعلیم، ادب زاویے اور جہات، شخصیات، عالمی ادبیات، سائنس، فلسفہ، خصوصی گفتگو، سلسلۂ صحافت، کتابوں کی دنیا اور خبر نامہ وغیرہ کے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مشمولات اپنے قارئین کی توقعات کو پر کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین نہ صرف اس رسالہ میں شامل اردو زبان و ادب کے موضوعات بلکہ موجودہ زمانے کے نت نئے ضوعات سے بھی محظوظ ہو رہے ہیں جبکہ دیگر رسائل اور میگزین کی تمام تر توجہ عام طور پر اردو زبان پر مرکوز رہتی ہے۔

اس شمارے کی خاص بات جو قابل غور ہے اس میں ترجمہ نگاری اور تراجم کے حوالے سے ہے۔ گوشۂ چراغ راہ میں کئی مضامین شامل کیے گئے جس تشنگی کو میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ رسائل اور میگزین میں باقاعدہ ترجمہ کے لیے ایک گوشہ ہونا چاہیے حالانکہ گذشتہ شماروں میں بھی عربی ادب، انگریزی ادب، تمل ادب اور تراجم کی طرف توجہ مرکوز رہی ہے جو کہ قابل صد ستائش ہے۔ اسی حوالے سے گوشۂ ادب زاویے اور جہات میں محمد خالد اعظمی کا مضمون 'ترجمہ نگاری اور علمی اشتراک دارالمصنفین کے حوالے سے' شامل کیا گیا ہے جس میں ترجمہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی مثال دے کر وضاحت کی کہ 'اردو زبان کی وسعت کے لیے جہاں ماہرین زبان سے اردو کی کتابیں تصنیف کرائیں وہیں بہت ساری کتابوں کا اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو اور فارسی میں ترجمہ بھی کروانے کا کام کیا۔ اسی طرح موجودہ دور میں دارالمصنفین نے اردو اور فارسی زبان و ادب کے مشرقی علوم اور تاریخ پر جس طرح کا علمی اور محققانہ کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

تذکیر و تانیث کا مسئلہ ابتدا سے ہی رہا ہے اور وقت کے ساتھ مختلف نظریات و تصورات قائم ہوئے اسی مسئلہ پر جلال لکھنوی نے اپنے رسالے مفید الشعرا میں جو ترمیم و اضافے کیے ہیں اس تعلق سے شاہ نواز فیاض نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ ادب زاویے اور جہات میں نامور محققین قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی کی تدوینی خدمات اور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں کی تخلیقی زبان اور پس نوآبادیاتی مباحث کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال حسین نے اس مضمون میں تحریر کیا ہے کہ "فاروقی کی نثر ایک ایسی روایت کا نیا عہد ہے جو اردو زبان میں عربی و فارسی زبان کے اثرات کے ساتھ ہی اپنے مقامی اظہار کو اجاگر کرتا ہے"۔ مزید لکھتے ہیں کہ "ان کے افسانے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ زبان نوآبادیاتی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہونے کے ساتھ ساتھ پس نوآبادیاتی تخیل کا ایک وسیلہ بھی ہو سکتی ہے"۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں فاروقی کے افسانوں کی تخلیقی زبان کا مختصر خاکہ ذہن نشیں ہو جاتا ہے جو قابل تعریف ہے۔

شخصیات میں کئی معتبر شعرا جیسے فانی بدایونی، بانی، شاکر ناطقی، راز اور مظفر حنفی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اس شمارے میں شامل رائے شیو موہن لعل ماتھر کا مضمون 'اپنشد' ہے جس کا بنیادی موضوع فلسفیانہ ہے۔ اصل میں اپنشد الہامی ویدک ادب کے افتتاحی حصے ہیں۔ ان کو ویدانت کہا جاتا ہے اور یہ خیال ہے کہ حقیقت اور صداقت کا اعلیٰ علم کلیتاً اپنشدوں میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اس طرح کے مضامین سے واقفیت حاصل کرنا صاحبان اردو زبان کے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس شمارے میں علمی، سائنسی اور فلسفیانہ مضامین شامل کیے گئے جو قابل صد ستائش ہیں۔

اس شمارے کے آخر میں کتابوں کے پر مغز تبصرے اور ہندوستان میں منعقد ہونے والی ادبی سرگرمیاں نظر آتی ہیں جس سے قارئین تمام ادبی سرگرمیوں سے واقف رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر 'اردو دنیا' اردو اسکالر کے مستقبل کے لیے مشعل راہ بن کر زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

ڈاکٹر سعدیہ پروین، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ادارہ

عالمی اردو کانفرنس

'وکست بھارت' ایک ایساوژن ہے جس کی تکمیل کے ساتھ آزادی کے سوسال بعد یعنی 2047 میں ہندوستان ایک ترقی یافتہ، خودکفیل اور سپر پاور بن جائے گا۔ معاشی خوش حالی، تکنیکی ترقی، بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، سماجی مساوات، استحکام اور پائیداری اس کے بنیادی حوالے ہیں۔ وکست بھارت کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ ملک سے غربت کو ختم کیا جائے، تمام شہریوں کو سوفیصد معیاری تعلیم مہیا کی جائے، صحت وتندرستی کے حوالے سے معیاری، سستی اور جامع سہولیات تک عوام کی رسائی ہو سکے، سوفیصد تربیت یافتہ مزدوروں کو قابل قدر روزگار مہیا کیا جاسکے، اقتصادی سرگرمیوں میں بڑی تعداد میں خواتین کی شمولیت کو یقینی بنایا جاسکے اور ہندوستانی کسانوں کو اس قدر طاقتور اور مستحکم بنایا جائے کہ بھارت دنیا میں ایک فوڈ باسکیٹ کے طور پر اپنی شناخت قائم کر سکے۔ وکست بھارت کی اس عظیم الشان مہم میں جہاں ملک کے تمام عملی اداروں اور شعبوں کی شمولیت ضروری ہے، وہیں ہندوستانی ثقافتی رنگارنگی کی نمائندگی کرنے والی زبانوں کا بھی غیر معمولی کردار ہوگا۔ کیوں کہ حکومتی منصوبہ بندیوں اور ادارہ جاتی جدوجہد کے ساتھ دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کی تخلیقی ذہنیت وذہانت اور اختراعی صلاحیتیں بھی قومی تعمیر اور اجتماعی ترقی کے سفر میں زادِ سفر کا کام کرتی ہیں، دماغی ریاضت اور ذہنی کدوکاوش کے بغیر محض مشینی کارپردازی اور انتظامی سرگرمیاں ہمیں ترقی یافتہ قوم میں تبدیل نہیں کرسکتیں؛ چنانچہ اس حوالے سے جہاں ہندوستان کی دیگر زبانوں کا اپنا کردار ہوگا وہیں اردو زبان کا کردار بھی ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا۔ ہندوستان کی اس خوب صورت اور ثقافتی جمالیات سے لیس زبان کے اسی متوقع کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی عالمی اردو کانفرنس کا مرکزی تھیم ترقی یافتہ ہندوستان کے وژن سے مربوط تھا اور اسے آنے والی ڈھائی دہائیوں کے لیے اردو زبان کا مشن قرار دیا گیا۔ اردو زبان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا وجود ہندوستانیت کے خمیر میں گندھا ہوا ہے اور اس نے ہر زمانے میں قومی تحریکات کی قیادت کے ساتھ ملک کی ذہنی، سماجی و ثقافتی تعمیر وتشکیل کا بھی فریضہ انجام دیا ہے۔ 2047 تک ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر ایک عظیم الشان قومی خواب ہے اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ملک کی دیگر مشترکہ اور زبانوں کے ساتھ اردو بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی، یہی اس عالمی اردو کانفرنس کا مرکزی پیغام وہدف تھا اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں 21 سے 23 فروری 2025 کے دوران ہونے والی اس کانفرنس کے سات تکنیکی اجلاسوں میں ہندوستان اور بیرون ہند کے درجنوں دانشوران کے مقالات، خطابات اور تاثرات وآرا سے جو نتیجہ خیز نکات نکل کر سامنے آئے، ان کی روشنی میں ہم قومی تعمیر وترقی کے مختلف شعبوں میں اردو زبان کے کردار کی تعیین کے ساتھ خود اس زبان کے فروغ کی مختلف النوع ممکنہ جہات کا اکتشاف کرسکتے ہیں۔ 'وکست بھارت کا وژن، اردو زبان کا مشن' ایک نئی لسانی تعبیر بھی ہے، جو اپنے جلو میں نئے مفاہیم رکھتی ہے اور ایک جدید قومی، لسانی وثقافتی باب کا بھی پتا دیتی ہے۔ ایک ایسا نیا باب جو ہندوستان کو کامیابی وکامرانی کی نئی راہوں کی طرف لے جائے گا۔ یہ وہ باب ہے جو اردو کو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے بھی نئے سرے سے مربوط کرے گا اور اس طرح ساری زبانیں مل کر 'وکست بھارت' کے وژن کی تکمیل کریں گی۔ کونسل کی اس کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے لے کر اختتامی تقریب تک ایک ہی دھن تھی جس کی ترنگیں فضاؤں میں بہہ رہی تھیں۔ کانفرنس کا ہر سیشن اپنی نوعیت وکیفیت کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل تھا۔ الغرض یہ کانفرنس کئی معنوں میں تاریخ ساز تھی۔

21 فروری 2025
(افتتاحی تقریب)

افتتاحی تقریب کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا عمل یا خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا لائحۂ عمل تھی۔ اسٹیج پر جو معروف اور قابل احترام مہمانان جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے بہت سے مشورے دیے، تدبیریں بتائی گئیں اور راستہ دکھایا گیا لیکن جو لوگ اسٹیج کے سامنے صف سامعین میں جلوہ کناں تھے ان کے لب خاموش تھے اور آنکھیں بول رہی تھیں، نئے خیال کی کونپلیں ان کے ذہن ودماغ میں روشن تھیں۔ جذبہ واحساس کی لہریں ان کے اندرون میں موجیں مار رہی تھیں۔

اردو محض ایک زبان نہیں، ایک ثقافت ہے، طرزِ زندگی ہے اور ایک عالمی سطح کی ثروت مند زبان ہے، جو ہندوستان کی تعمیر اور وکست بھارت کا آسمان چھونے میں بھی اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف دانشور ومفکر رام بہادر رائے نے عالمی اردو کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کو جہاں اپنے ماضی اور حال پر فخر محسوس کرنا چاہیے وہیں وکست بھارت کے وژن کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے اسے سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان بنانا بھی ضروری ہے۔ رائے صاحب کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ ڈاکٹر شمس اقبال کی سربراہی میں کونسل اردو کے فروغ کے ساتھ وکست بھارت کی مہم میں بھی ضروری اقدامات کرے گی۔ مسلم راشٹریہ منچ کے مارگ درشک اندریش کمار بطور مہمان خصوصی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے کہا کہ وکست بھارت کی تعمیر میں حب الوطنی کا عمومی جذبہ بھی اہم کردار ادا کرے گا۔ ہندوستان جس طرح ماضی میں سارے جہاں سے اچھا تھا اسی طرح مستقبل میں بھی ساری دنیا میں امتیازی مقام حاصل کرسکتا ہے اور ملک کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے اردو سمیت بھارت کی تمام زبانوں کے ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں کو آگے آنا چاہیے۔

عالمی اردو کانفرنس کا جب افتتاح ہوا تو قومی ترانہ گایا گیا۔ لوگ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر قومی ترانے کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ یہ ترانہ محفل میں موجود ہر فرد کے لیے سازِ زیرلبی بن گیا تھا۔ پورا ہال جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوکر جھوم رہا تھا۔ اس کے بعد اجتماعی طور پر شمع افروزی کی رسم بھی ادا کی گئی۔ اس طرح ایک تہذیبی روایت کی پیروی کی گئی۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے تمام مہمانوں کا گلدستہ، شال اور مومنٹو پیش کرکے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے تعارفی کلمات میں تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور کانفرنس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ وکست بھارت کا وژن ایک ایسا قومی خواب ہے جس کی تعبیر کے لیے سماج کے ہر طبقے کو اجتماعی رول ادا کرنا ہوگا، اس میں ملک بھر کی زبانوں کی بھی غیر معمولی حصے داری ہوگی جن میں ہماری اردو زبان بھی شامل ہے۔ انھوں نے تحریک آزادی سے لے کر آج تک ملک کی تشکیل وترقی میں اردو زبان اور اس کے فنکاروں کے ناقابل فراموش کردار پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ آج بھی ہمیں وہی کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

وزارت تعلیم حکومت ہند میں محکمۂ لینگویجز کی ڈائرکٹر محترمہ سمن دکشت اس محفل کا افتخار تھیں۔ ان کی موجودگی سب کے لیے باعث حوصلہ وتقویت تھی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو بہت خوبصورت زبان ہے ۔اس زبان کے الفاظ ہندوستان کی تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں، جو اس زبان کی اہم خصوصیت ہے۔ کونسل 1996 سے مختلف اسکیموں کے ذریعے اردو کو عوام تک پہنچا رہی ہے، یہ عالمی کانفرنس بھی اسی کا حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو کتابوں سے نکل کر عوام تک پہنچے، صرف بزرگوں، عالموں اور دانشوروں کی زبان بن کر نہ رہ جائے، اس میں وہ خوبیاں خلق ہوں کہ یہ نئی نسل کی بھی زبان بنے۔ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر بھی اردو کا استعمال کرنا چاہیے اور وکست بھارت کی تعمیر میں اردو کا کردار طے کرنا چاہیے۔ مہمان اعزازی پروفیسر اختشام حسنین (سابق وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و سینٹر یونیورسٹی حیدرآباد) نے کہا کہ وکست بھارت اس کانفرنس کا مرکزی موضوع ہے، جس کی تعمیر میں ہمارے ملک کے تمام ثقافتی مظاہر کا اہم رول ہوگا۔ انہی میں ہماری اردو زبان بھی ہے اور اس کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ ہے۔ اس کے ننانوے فیصد افعال سنسکرت بنیاد رکھتے ہیں۔ اور نئی نسل میں اردو کے تئیں بڑھتی دلچسپی نہایت خوش آیند ہے۔

کانفرنس کے مہمان اعزازی، این بی ٹی کے ڈائرکٹر یوراج ملک نے اپنے پر مغز خطاب میں کہا کہ اس کانفرنس کا افتتاح عالمی یوم مادری زبان کے یادگار موقعے پر ہوا ہے، جس کا پیغام ہی یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف اپنی مادری زبان بولنے اور پڑھنے میں احساسِ فخر ہونا چاہیے؛ بلکہ اس کے تحفظ کے لیے ہمیں ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں، ایک ثقافت ہے اور ہماری زبانیں ہماری ثقافت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ہر زبان کی ایک ثقافت ہوتی ہے اور ہر ثقافت کی ایک زبان ہوتی ہے، انھیں ایک دوسرے سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ یوراج ملک نے یہ

بھی کہا کہ وکست بھارت کا تصور صرف معاشی نہیں، بلکہ فکری، سماجی، ثقافتی، روحانی ولسانی ترقی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اب ہم اردو کو صرف ادبی وثقافتی موضوعات تک محدود نہیں رکھ سکتے، بلکہ اسے سائنسی و تکنیکی موضوعات کی طرف بھی آنا ہوگا۔ اردو تخلیقات کا ترجمہ دوسری زبانوں میں اور دوسری زبانوں کے اچھے ادب کا ترجمہ اردو میں بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ثقافتی تبادلے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے ملک کی دوسری درجنوں زبانوں کی خصوصیات سے آگاہی حاصل ہو اور اردو تخلیقات کی خوشبو دوسری زبانوں کے قارئین اور ادب دوستوں تک بھی پہنچے۔

اس سہ روزہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کا اختتام قومی ترانے پر ہوا۔ اس موقعے پر ملک و بیرون ملک کے اردو دانشوران، اساتذہ اور محبان اردو نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔

(محفلِ مشاعرہ)

افتتاحی تقریب کے بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اردو کے نامور شعرا شریک ہوئے۔ محفل مشاعرہ کی صدارت بزرگ شاعر اظہر عنایتی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مشہور ناظم مشاعرہ منصور عثمانی نے انجام دیے۔ ان کی نظامت نہایت خوبصورت تھی۔ وہ شاعروں کو اس طور سے دعوت سخن دیتے کہ ان کے کلام کے محاسن و امتیازات عیاں ہو جاتے۔ مشاعرے کے مہمان خصوصی ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) جناب غلام علی کھٹانا تھے۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کو عام لوگوں کی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس زبان کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا جائے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کی زبان اردو نہیں ہے، مگر اس زبان کی شیرینی و خوب صورتی کی وجہ سے وہ اسے سیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو اردو سکھانے کی کوششیں کی جائیں۔

مشاعرے میں اردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے اہم اور موقر شعرا شریک ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ مشاعرہ روایتی مشاعروں سے بہت مختلف تھا۔ اس محفل مشاعرہ میں صدر مشاعرہ اظہر عنایتی اور ناظم منصور عثمانی سمیت پروفیسر غضنفر، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر شائستہ یوسف، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، جناب راجیش ریڈی، پروفیسر احمد محفوظ، جناب عالم خورشید، جناب نعمان شوق، جناب تحسین منور جناب شاداب الفت اور جناب احمد اشفاق جیسے اہم شعرا شامل تھے۔ یہ شعرا میدان شعر اور دانشوران علم و ادب کی نگاہ میں قابل قدر شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں وقار و سنجیدگی اور معنوی تہہ داری کے عناصر خوب خوب پائے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے سامعین کو اپنے بہترین اور خوبصورت اشعار سے محظوظ کیا۔ ان کے کلام میں زندگی کی نئی بصیرتیں بھی تھیں اور زمانے کے رنج والم کی تصویریں بھی۔ حسن و عشق کی باتیں بھی تھیں اور رومانی دل فریبیاں بھی۔ ہر طور سے ان شعرا کا کلام باعث تسکین ثابت ہوا۔ منتخب اشعار پیش ہیں:

ہے کفر کہ ایمان سمجھ میں نہیں آتا
یہ عشق مری جان سمجھ میں نہیں آتا
چلو چلتے ہیں متھرا میں کشن کی راس دیکھیں گے
کشن کی بانسری سے جاگتا احساس دیکھیں گے

(تحسین منور)

جو باندھ لے نظر کو وہ زنجیر چلے گی
اس نے کہا کہ آپ کی تصویر چلے گی
چراغ صبح کو بھی اس قدر جلدی تھی بجھنے کی
ابھی آنکھوں میں ہم نے رات ساری روک رکھی ہے

(شاداب الفت)

قاعدے بازار کے اس بار الٹے ہو گئے
آپ تو آئے نہیں اور پھول مہنگے ہو گئے
ایک دن دونوں نے اپنی ہار مانی ایک ساتھ
ایک دن جس سے جھگڑتے تھے اسی کے ہو گئے

(نعمان شوق)

سالہا سال سے ایک شور ہے برپا مجھ میں
جب کہ رہتا ہے کوئی آدمی تنہا مجھ میں
ایک مدت ہوئی ایک پیاس خفا ہے مجھ سے
آ ادھر دیکھ لے بیتابِ دریا مجھ میں

(احمد اشفاق)

کوہساروں سے کہہ دو جھک جائیں
لمبے سایوں سے دل لرزتا ہے
سوکھے سبزے کے ڈھیر پر اب بھی
کوئی آہستہ پاؤں چلتا ہے

(شائستہ یوسف)

جب نہیں جانتے ہونا کیا ہے
پھر شب و روز کا رونا کیا ہے
جب کہا روتے ہوئے مر جاؤں
کوئی بولا کہ مرو نا کیا ہے

(احمد محفوظ)

بہت ہنسنے کی عادت کا یہی انجام ہوتا ہے
کہ ہم رونا بھی چاہیں تو کبھی رویا نہیں جاتا

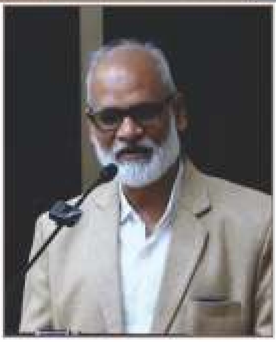

تیرے پاس آنے میں آدھی عمر گزری ہے
آدھی عمر گزرے گی تجھ سے دور جانے میں
(عالم خورشید)

داد کس نے پائی ہے آج تک زمانے سے
درد کم نہیں ہوتا زخم کو دکھانے سے
اک چراغ جلتا ہے اک چراغ بجھتا ہے
اک ہوا کے ہونے سے اک ہوا کے آنے سے
(مہتاب حیدر نقوی)

اب یہ تنہائی کا منظر نہیں دیکھا جاتا
دل جو روتا ہے سمندر نہیں دیکھا جاتا
قتل کرنے کا تو مقصد ہی الگ ہوتا ہے
تیر تلوار یا خنجر نہیں دیکھا جاتا
(قاسم خورشید)

کسی دن زندگانی میں کرشمہ کیوں نہیں ہوتا
میں ہر دن جاگ تو جاتا ہوں زندہ کیوں نہیں ہوتا
شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں
(راجیش ریڈی)

حالات کیسے دوستو اس گھر کے ہو گئے
شیشہ مزاج لوگ بھی پتھر کے ہو گئے
ہر بار دوستوں نے دیا مصلحت کا ساتھ
پھر یہ ہوا کہ ہم بھی ستمگر کے ہو گئے
(منصور عثمانی)

تم کو پانے کی بات کرتا ہے
مرے دل کا دماغ دیکھو نا
وہ جو دیکھے تو دل کو ڈھارس ہو
وہ جو دیکھے تو زخم بھر جائیں
(غضنفر)

ایک آنسو اجنبیت کا ندی بنتا گیا
ایک لمحہ تھا تکلف کا صدی بنتا گیا
تمہارا شہر ہے تم جو کہو بجا ہے وہ
ہمارا صرف خدا ہے مگر خدا ہے وہ
(شہپر رسول)

پہلے حق گوئی کا کردار دیا جاتا ہے
پھر کہانی میں اسے مار دیا جاتا ہے
یہی ہو جاتا ہے بچوں کے بگڑنے کا سبب
بے ضرورت جو بہت پیار دیا جاتا ہے
(اظہر عنایتی)

22 فروری 2025
(پہلا اجلاس: اردو ذریعۂ تعلیم)

کانفرنس کے دوسرے دن چار تکنیکی سیشنز ہوئے۔ پہلا سیشن 'اردو ذریعہ تعلیم' کے موضوع پر تھا۔ اس سیشن میں افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم کا موجودہ منظرنامہ کئی اعتبار سے قابل غور ہے جس پر ہمیں توجہ دینے کے ساتھ موجودہ حالات کو بہتر بنانے کی ممکنہ صورتوں کی جستجو کرنی چاہیے۔ اسی مقصد سے آج کا یہ سیشن منعقد کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ قابل عمل نکات سامنے آئیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس کانفرنس میں تعلیمی اور ادبی میدان سے تعلق رکھنے والے بہترین اذہان شرکت کر رہے ہیں جو ہماری وکست بھارت مہم میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس سیشن کے مقالہ نگاروں میں پروفیسر ریاض احمد اور پروفیسر طلعت عزیز شامل تھے۔ ڈاکٹر عمار رضوی اور پروفیسر غضنفر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر عمار رضوی نے اپنی صدارتی تقریر میں زمینی سطح پر اردو کے فروغ اور اردو ذریعہ تعلیم کے شعبے کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف عملی و قانونی تدبیروں کی نشان دہی کی۔ جبکہ پروفیسر غضنفر نے اردو ذریعہ تعلیم کو درپیش چیلنجز پر گفتگو کرتے ہوئے ان سے نمٹنے کے مختلف طریقے بتائے۔ شرکائے بحث میں پروفیسر فاروق انصاری، پروفیسر محمد فیض احمد، ڈاکٹر سید ظفر اسلم اور ڈاکٹر احمد علی جوہر شامل تھے۔ انھوں نے اردو ذریعہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کی بات کی اور کہا کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اردو کے تدریسی مواد کو جدید عہد کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ نصرت جہاں نے اس سیشن کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا۔

(دوسرا اجلاس: اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے انفوٹینمنٹ وسائل کا استعمال)

اس سیشن کی صدارت سینئر فلم ساز مظفر علی اور محترمہ کامنا پرساد کر رہے تھے۔ پروفیسر شافع قدوائی، جناب جاوید دانش اور ڈاکٹر سلیم عارف نے اس سیشن میں بہت پر مغز مقالے پیش کیے۔ ان مقالات میں تفریح کے روایتی شعبوں کے ساتھ سائنس وٹکنالوجی کی بدولت پیدا ہونے والے نئے اطلاعاتی وتفریحی شعبوں میں اردو کا Space بڑھانے اور اس حوالے سے درپیش مسائل کے حل کی طرف توجہ دلائی گئی۔ صدر اجلاس کامنا پرساد نے اپنی تقریر میں خاص طور پر اردو داستان اور مشاعروں کی روایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آج بھی ہماری داستانیں اور مشاعرے نئی نسل کو اردو کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ سیشن کے دوسرے صدر سینئر فلم ساز مظفر علی آن لائن شریک تھے، انھوں نے ہندوستانی سنیما کی مقبولیت و ہر دلعزیزی میں اردو زبان و اردو شاعری کی غیر معمولی حصے داری پر خوب صورت گفتگو کی۔ جناب معصوم مراد آبادی، تحسین منور اور ڈاکٹر مرزا عبدالباقی بیگ اس سیشن میں بطور شرکائے بحث شریک ہوئے۔ ان حضرات نے بھی قدیم ہندوستانی تفریحی شعبوں میں اردو کے استعمال کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی نئے اطلاعاتی وتفریحی وسائل پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اردو زبان کے فروغ و اشاعت میں ان کے استعمال کے کیا کچھ فائدے ہیں۔ ڈاکٹر منتظر قائمی نے اس سیشن کی نظامت کی۔

(تیسرا سیشن: نو جوان نسل میں مختلف علوم کی ترویج و اشاعت)

اس سیشن میں پروفیسر اور یس صدیقی، پروفیسر ثروت النسا خان اور شاداب الفت نے قابل قدر مقالے پیش کیے۔ پروفیسر روی پرکاش ٹیک چندانی نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں نئی نسل کو عصری علوم وفنون سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ اردو زبان کو غیر اردو داں طبقے تک لے جانے کی خصوصی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ اردو کی مقبولیت کا دائرہ وسیع تر ہو سکے۔ شرکائے بحث میں فیروز بخت احمد، محترمہ شاہ تاج خان، ڈاکٹر سلمان عبدالصمد اور محترمہ استوتی اگروال شامل تھے۔ ان حضرات نے اپنی گفتگو سے پورے سیشن کو پر رونق بنا دیا اور موضوع کے حوالے سے کئی اہم سوال قائم کیے اور اپنے قیمتی تاثرات کا اظہار کیا۔ اس دوران نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے مختلف پہلو زیر بحث آئے اور کہا گیا کہ عہد جدید کی تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے تدریسی مواد اور اساتذہ تیار کیے جانے چاہئیں۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر مسرت صاحبہ فرما رہی تھیں۔

(چوتھا اجلاس: عوامی تعلیمی نظام میں اردو کا سمٹتا دائرہ اور اصلاحی اقدامات)

اس سیشن میں آئی آر ایس جناب گلزار وانی اور ڈاکٹر محمد احسن نے قابل قدر مقالات پیش کیے۔ ان کے مقالوں میں موضوع کے حوالے سے بہت سارے بنیادی مباحث سامنے آئے۔ پروفیسر اے آر فتیحی اور پروفیسر خواجہ محمد شاہد اس سیشن میں صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز رہے اور آخر میں اپنے صدارتی کلمات سے سامعین کو نہ صرف محظوظ کیا بلکہ موضوع پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی۔ شرکائے بحث میں پروفیسر شاہد رضا جمال اور ڈاکٹر محمد رضوان علی تھے۔ اس سیشن کے مقالہ نگاران، شرکائے بحث اور صدور نے موجودہ تعلیمی نظام میں اردو کے سمٹتے دائرے کو ایک حقیقت قرار دیا اور اس کے تدارک کی مختلف تدبیریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے نئے زمانے کے کچھ مثبت لسانی پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کے اظہار تشکر کے ساتھ اس دن کے تکنیکی سیشنز کا اختتام ہوا۔

(داستانِ رادھا کرشن)

شام چھ بجے 'اردو کے مدھوبن میں رادھا کرشن' کے عنوان سے چنمے مشن، لودھی روڈ میں ایک کلچرل پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس کے رائٹر و ڈائرکٹر پروفیسر دانش اقبال تھے۔ اس کی پیش کش محترمہ نیلاکشی اور پارنگت پریاگ کلا کیندر کے فن کاروں نے کی۔

اس موقع پر وزارت تعلیم حکومت ہند میں محکمۂ لینگویجز کی ڈائرکٹر محترمہ سمن دکشت صاحبہ مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے شال اور مومنٹو کے ذریعہ ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ یہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا حسن ہے جس نے اردو کے مدھوبن میں رادھا کرشن کو جمع کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری میں رادھا کرشن کی محبت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ہمارا یہ پروگرام اس کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے اس منظوم داستان کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ اردو زبان و ادب میں گنگا جمنی تہذیب کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ خاص طور سے رادھا کرشن کا

موضوع نظیر اکبرآبادی کے یہاں کثرت سے موجود ہے۔ پروفیسر دانش اقبال اس منظوم داستان کے خالق اور ہدایت کار تھے۔ انصرام الحق میوزک ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ محترمہ نیلاکشی اور پارنگت پریاگ کلا کیندر کے فنکاروں نے رقص اور کوریوگرافی پیش کی۔ اس موقع پر دہلی اور اس کے اطراف سے بڑی تعداد میں ناظرین وشائقین نے شرکت کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تمام اراکین بھی اس موقع پر موجود تھے۔

23 فروری 2025

(پانچواں : اردو تخلیقات میں سماجی، ثقافتی و سیاسی اقدار کی عکاسی)

تیسرے دن صبح دس بجے کانفرنس کا پانچواں تکنیکی اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ اور پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے اس سیشن میں بیش قیمتی مقالات پیش کیے۔ انھوں نے اپنے مقالوں میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کس طور سے اردو تخلیقات میں جلوہ گر ہے۔ اس سیاق میں اردو شاعری اور نثر کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا۔ اردو شاعری اور نثر کی مختلف اصناف کے حوالے سے اردو تخلیقات میں ہندوستان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی اقدار کی عکاسی پر گفتگو ہوئی۔ شرکائے بحث میں پروفیسر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان اور ڈاکٹر بالمیکی رام شامل تھے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد اور پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔ ان حضرات نے نہ صرف سیشن میں پڑھے گئے مقالات اور شرکائے بحث کے تاثرات پر روشنی ڈالی بلکہ انھوں نے اردو ادب میں

ہندوستانی تہذیب وثقافت کی نمائندگی اوراس کے اثرات پر بھرپور گفتگو بھی کی۔ان کے پرمغز صدارتی خطبات نے مختلف ادبی مباحث کی نہ صرف جھلکیاں پیش کیں بلکہ حاضرین کو ان ادبی پہلوؤں پر غور وخوض کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ دوران گفتگو یہ بھی کہا گیا کہ اردو ادب نہ صرف ہندوستانی زبانوں کے الفاظ ومزاج کا آمیزہ ہے، بلکہ ہندوستانی ثقافت کی عکاسی بھی اس زبان میں سب سے زیادہ ہوئی ہے۔ڈاکٹر ثاقب فریدی نے اس سیشن کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(چھٹا اجلاس: اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے آرٹیفیشیل انٹیلی جنس کا استعمال)

اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں پروفیسر رحمت یوسف زئی اور ڈاکٹر پرویز احمد خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔انھوں نے آرٹیفیشیل انٹیلی جنس میں اردو کی شمولیت کے حوالے سے اہم نکات پیش کیے اور بتایا کہ آج کے دور میں آرٹیفیشیل انٹیلی جنس کی کیا کچھ اور کس قدر ضرورت ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ آرٹیفیشیل انٹیلی جنس سے اردو کا کس قدر مستحکم رشتہ قائم ہوسکتا ہے۔اس سیاق میں سوشل میڈیا پلیٹ فارم اور مشینی ترجموں کو خصوصی طور پر گفتگو کا محور بنایا گیا۔اس پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی کہ آج کے دور میں مشینی ترجمے کی کیا اہمیت ہے اور کس نوع کے ایپس آج مشینی ترجموں کے لیے موجود ہیں۔ مشینی ترجموں میں کیا کچھ پریشانیاں پیش آتی ہیں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے بتایا کہ کمپیوٹر میں مصنوعی ذہانت کی ابتدا کس طرح ہوئی، کس طرح مصنوعی ذہانت ارتقاپذیر ہوئی اور آج کے دور میں مصنوعی ذہانت کس طرح کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر شمیم احمد اور جناب احمد اشفاق نے بحث میں حصہ لیا۔اس سیشن کی صدارت پروفیسر اعجاز احمد شیخ اور پروفیسر محمد جہانگیر وارثی نے کی۔ان حضرات نے بھی اپنے صدارتی خطابات میں مشینی ترجمے اور اے آئی کے مختلف پلیٹ فارمز کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر عبدالحی نے کی۔ ڈاکٹر عبدالحی نے نظامت کے دوران مصنوعی ذہانت پر خود بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور بتایا کہ آج ہم اردو میں کس طرح مصنوعی ذہانت کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔

(ساتواں اجلاس: بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کے درمیان ہموار رابطے کا استحکام)

اس سیشن کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ثاقب ہارونی اور ڈاکٹر نیلوفر خوجیوا تھے۔ڈاکٹر ثاقب ہارونی نے اپنے مقالے میں بتایا کہ نیپال میں اردو کی کیا صورت حال ہے اور کس طرح نیپال میں اردو کی

ترویج واشاعت ہورہی ہے۔ڈاکٹر نیلوفر خوجیوا ازبکستان سے تشریف لائی تھیں۔انھوں نے ازبکستان میں اردو زبان وادب کی مرحلہ وار ترقی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنے مقالے میں یہ بھی بتایا کہ کس طرح ازبیک میں اردو کتابوں کے ترجمے ہورہے ہیں۔اس سیاق میں انھوں نے کئی ایسے اساتذہ کا ذکر کیا جنھوں نے ازبکستان میں اردو کے فروغ میں سربراہانہ کردار ادا کیا ہے۔ان اساتذہ میں انھوں نے خصوصی طور پر ازبکستان میں اردو کے سب سے بڑے سرپرست مرحوم استاد رحمٰن بیردی محمد جانوف کا ذکر کیا اور بتایا کہ اردو زبان کی تدریس کے حوالے سے ان کی کیا کچھ خدمات ہیں۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کے بعض اساتذہ نے بھی ازبکستان میں اردو کی ترویج واشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر سراج الدین نور متوف اور ڈاکٹر احسن ایوبی نے بطور شرکائے بحث اس سیشن میں شرکت کی اور بتایا کہ دیگر ممالک میں اردو کی کیا کچھ صورت حال اور مسائل ہیں۔اور یہ کہ اردو کی جونئی بستیاں ہیں وہاں کس طرح اردو کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر حسنین اختر اور ڈاکٹر یحیا عبدالرحمٰن اس سیشن کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔انھوں نے بھی صدارتی خطبے میں مختلف ممالک میں اردو کے مسائل وصورت حال پر روشنی ڈالی۔اس سیشن کی نظامت کے فرائض نایاب حسن نے انجام دیے۔

اختتامی اجلاس

23 فروری کو شام پانچ بجے اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا۔اختتامی تقریب کے مہمان اعزازی پروفیسر غضنفر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کانفرنس ہر اعتبار سے نہایت کامیاب رہی اور افتتاحی پروگرام سے لے کر آخری سیشن تک اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے حوالے سے نہایت قیمتی نکات سامنے آئے۔انھوں نے کہا کہ ہند و بیرونِ ہند کے موقر دانشوران نے اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں اردو تعلیم کی بہتری، اردو رسم الخط کے تحفظ اور اس زبان کی مجموعی ترقی کے لیے جو باتیں کی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ضروری ہے کہ ہم ان پر عملی اقدامات بھی کریں۔انھوں نے کہا کہ روزانہ تکنیکی اجلاسوں کے ساتھ کلچرل پروگراموں کا انعقاد بھی اس کانفرنس کی ایک امتیازی خصوصیت تھی جس نے اردو زبان کے روشن وقابلِ فخر ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر غضنفر نے اردو کو گلاب سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ زبان ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب کی خوب صورت عکاسی کرتی ہے۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے تاریخی مراحل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ایک لچک دار اور تغیرات کو قبول کرنے والی زبان ہے۔ اس نے ہمیشہ قومی، سماجی و ثقافتی ضروریات کو ملحوظ رکھا اور سائنٹفک سوچ کو قبول کرنے میں کسی جھجک سے کام نہیں لیا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ وکست بھارت کی تعمیر کے لیے بھی اردو کو نئے ٹرینڈز سے ہم آہنگ ہونا ہے اور ہمارے دانشوران کو قومی تقاضوں کی تکمیل کے لیے تیار رہنا ہے۔شمس اقبال نے کہا کہ ہمیں اپنی زبان کو لے کر زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، اردو کا حال بھی خوش آئند ہے اور مستقبل بھی امکانات سے معمور ہے۔انھوں نے کہا کہ سرکاری سطح پر بھی اس زبان کو بھرپور معاونت وحمایت حاصل ہے، البتہ ہمیں اپنے حصے کی ذمے داری ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ہم اردو کو روزمرہ کی ضروریات کا حصہ بنائیں۔اس کے فروغ کے لیے ہر شخص کو انفرادی طور پر کوششیں کرنی چاہئیں۔ ہر قسم کے احساس کمتری سے باہر نکل کر اپنی زبان کے تحفظ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اس وقت ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب عالیہ کا اردو ترجمہ اور اردو کے اچھے ادب کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ضروری ہے، تاکہ ہندوستانی زبانوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کو دور کیا جاسکے۔

آخر میں ڈاکٹر شمس اقبال نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے کانفرنس میں شریک تمام قومی و بین الاقوامی

مہمانوں، اپنے معاونین، وزارتِ تعلیم، خصوصاً وزیر اعظم عزت مآب شری نریندر مودی جی کا شکریہ ادا کیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد میں حکومت کا ہر قدم پر بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عبدالباری نے کی۔

شامِ صوفیانہ

کانفرنس کی اختتامی تقریب کے بعد شام چھ بجے شامِ صوفیانہ (محفل قوالی) کا اہتمام کیا گیا۔ مشہور و معروف قوالی گروپ نظامی بندھو نے اس میں مختلف النوع کلام پیش کیے۔ اس سے قبل فیضان الحق اور نہاں رباب نے قوالی کی روایت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی اور انھوں نے سامعین کو بتایا کہ قوالی کا ہندوستان کی صوفیانہ روایات سے گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ قوالی نے ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور قومی ہم آہنگی کے استحکام میں بھی اس کی حصے داری رہی ہے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مہمان خصوصی شری سنجوگ کمار، کونسل کے معزز رکن جناب ماجد تالیکوٹی اور نظامی بندھو کی خدمت میں شال اور مومنٹو پیش کیا۔ نظامی بندھو نے حمدیہ، نعتیہ وصوفیانہ کلام کے علاوہ مختلف غزلیہ اشعار بھی پیش کیے۔ ان کے کلام سے نہ صرف سامعین مسرور ومحظوظ ہوئے؛ بلکہ خوب داد وتحسین سے بھی نوازا۔ ■

ناظمین اجلاس

تصویری جھلکیاں

Sham-e-Soofiyana

محمد معمور علی

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی

تعلیمی ٹیکنالوجی کے اہم کردار کو تسلیم کرنے اور قومی پالیسی برائے تعلیم میں بیان کردہ کلیدی اصولوں اور مقاصد کی مکمل سمجھ بنانے کی ضرورت ہے۔ اس مقالے کا ایک اہم مقصد تعلیمی پالیسی اور ٹیکنالوجی کے درمیان پیچیدہ تعلق کو تلاش کرنا ہے۔ اسکول کی تعلیم کے مختلف مراحل میں ٹیکنالوجی کے کردار کی نشاندہی کرنا اور اسے اسکول کی تعلیم کے لیے قومی نصابی فریم ورک کی روشنی میں کس طرح لاگو کیا جاسکتا ہے اس پر خصوصی طور پر تبادلہ خیال کیا جائے گا۔

تعلیمی ٹیکنالوجی ڈیجیٹل ٹولز اور جدید طریقوں کے ذریعے سیکھنے کے تجربے کو بڑھا کر تعلیمی نظام کو تبدیل کر رہی ہے۔ تعلیمی نظام میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی کا فائدہ اٹھانا طلبا کے سیکھنے اور اساتذہ کی ہدایات کی فراہمی کے طریقے کو بدل دیتی ہے۔ اس میں مزید متحرک اور ذاتی نوعیت کے سیکھنے کے تجربات پیدا کرنے کے لیے انٹرایکٹو سافٹ ویئر، ورچوئل کلاس رومز، اور لرننگ مینجمنٹ سسٹم جیسے ٹولز کو مربوط کرنا شامل ہے۔ ڈیجیٹل ٹکنالوجی مختلف ہدایات کو قابل بناتی ہے، جس سے طلبا اپنی رفتار سے اور اپنی منفرد ضروریات کے مطابق سیکھ سکتے ہیں۔ یہ وسائل اور تعلیمی مواد کی ایک وسیع رینج تک رسائی میں بھی سہولت فراہم کرتا ہے، جغرافیائی رکاوٹوں کو توڑتا ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ معیاری تعلیم سب کے لیے قابل رسائی ہو۔

تعلیم اور ٹکنالوجی کا ایک علامتی رشتہ ہے، جو مسلسل ایک دوسرے کو متاثر اور تشکیل دیتے ہیں۔ آن لائن کورسز اور ورچوئل کلاس رومز سے لے کر تعلیمی ایپس اور انٹرایکٹو وائٹ بورڈز تک، ٹیکنالوجی نے ذاتی نوعیت کے سیکھنے کے تجربات کے امکانات کو بڑھا دیا ہے۔ اس کے برعکس، تعلیم نئی ٹیکنالوجیز کو تیار کرنے کے لیے درکار مہارتوں اور علم کو فروغ دے کر ٹکنالوجی میں ترقی کرتی ہے۔

تعلیمی ٹیکنالوجی کا دائرہ وسیع اور مسلسل ترقی پذیر ہے۔ اس میں ہارڈ ویئر، جیسے کمپیوٹر، ٹیبلٹ، انٹرایکٹو وائٹ بورڈز اور آڈیو ویژول آلات کے ساتھ ساتھ سافٹ ویئر ایپلی کیشنز، لرننگ مینجمنٹ سسٹم اور آن لائن پلیٹ فارم شامل ہیں۔ ورچوئل ریئلٹی، آگمنٹڈ ریئلٹی، مصنوعی ذہانت اور دیگر ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجیز کا انضمام تعلیمی ٹیکنالوجی کے دائرہ کار کو مزید وسعت دیتی ہے، جس سے سیکھنے کے عمیق اور متعامل تجربات کے نئے امکانات کھلتے ہیں۔

عصری تعلیم میں، تعلیمی ٹیکنالوجی کلاس روم کی ترتیب تک محدود نہیں ہے بلکہ آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کے ماحول تک پھیلی ہوئی ہے۔ ای لرننگ پلیٹ فارمز، ویڈیو کانفرنسنگ ٹولز، اور تعلیمی ایپس جدید تعلیم کے لازمی حصے بن چکے ہیں، خاص طور پر ڈیجیٹل اور فاصلاتی تعلیم کی طرف عالمی تبدیلی کے پیش نظر یہ اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ ترقی تک بھی پھیلا ہوا ہے، کیونکہ ٹیکنالوجی مسلسل تربیت اور اعلیٰ مہارت کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 اور تعلیم میں ٹیکنالوجی

قومی پالیسی برائے تعلیم ملک کے تعلیمی نظام کے لیے ایک جامع اور تبدیلی کا خاکہ پیش کرتی ہے۔ پالیسی آن لائن اور بلنڈڈ لرننگ، اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی اختراع کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال پر زور دیتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی تبدیلی کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے، قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 تعلیم میں ڈیجیٹل ٹولز اور وسائل کو مربوط کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ اس میں سیکھنے کے تجربے کو بڑھانے کے لیے مصنوعی ذہانت اور دیگر ٹیکنالوجیز کا استعمال شامل ہے۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 ہندوستان میں تعلیمی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے تکملہ کے طور پر تعلیمی ٹیکنالوجی کے انضمام پر زور دیتی ہے۔ ڈیجیٹل انفراسٹرکچر، آن لائن تعلیم، اساتذہ کی تربیت، اور اختراع کو فروغ دے کر، پالیسی ایک جدید اور ٹیکنالوجی پر مبنی تعلیمی ماحولیاتی نظام کا تصور کرتی ہے جو طلبا کو 21ویں صدی کے چیلنجوں کے لیے تیار کرتی ہے۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 میں شامل تعلیمی ٹیکنالوجی کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

ڈیجیٹل بنیادی ڈھانچہ

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 نے تعلیمی تبدیلی کو آسان بنانے کے لیے ایک مضبوط ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کی تشکیل کو ترجیح دی ہے۔ اس میں تمام تعلیمی اداروں، یہاں تک کہ دور دراز علاقوں میں بھی تیز رفتار انٹرنیٹ کی رسائی کو یقینی بنانا شامل ہے۔ یہ پالیسی قابل اعتماد نیٹ ورکس کی ترقی، ضروری ہارڈ ویئر کی فراہمی اور ڈیجیٹل مواد کے ذخیرے کو ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کرنے کی وکالت کرتی ہے (پیرا 24.4 (بی)، پیرا 2.6 اور 24.5)۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں دونوں کے اندر ایک مضبوط ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کے قیام پر نمایاں زور دیتی ہے۔ یہ جدید تعلیم میں ٹیکنالوجی کے اہم کردار کو تسلیم کرتی ہے اور اس کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ تمام طلبا، ان کے سماجی و اقتصادی پس منظر سے قطع نظر، ڈیجیٹل وسائل تک

مساوی رسائی حاصل کریں۔ قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 کے بنیادی مقاصد میں سے ایک تعلیمی اداروں میں انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی کی سہولت فراہم کرنا بھی ہے۔ ایسا کرنے سے، پالیسی ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کرنے اور ایک ایسا ماحول بنانے کا تصور کرتی ہے جہاں طلبا تعلیمی مقاصد کے لیے انٹرنیٹ کی وسیع صلاحیت کو استعمال کر سکیں۔ یہ رابطہ نہ صرف آن لائن سیکھنے کے مواد تک رسائی کی سہولت فراہم کرتا ہے، بلکہ باہمی تعاون اور باہمی سیکھنے کے تجربات کو بھی قابل بناتا ہے، اس طرح ایک زیادہ متحرک اور جامع تعلیمی ماحولیاتی نظام کو فروغ دیتی ہے۔ ان اقدام کا مقصد ٹیکنالوجی تک رسائی میں تفاوت کو دور کرنا ہے، اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ ہر سیکھنے والے کے پاس وہ ٹولز ہوں جو انھیں ڈیجیٹل مواد سے منسلک ہونے اور آن لائن سیکھنے میں حصہ لینے کے لیے درکار ہیں۔ طلبا کو ڈیجیٹل آلات سے آراستہ کرکے، پالیسی انھیں تعلیمی وسائل کی وسیع رینج، ای کتابوں اور ملٹی میڈیا مواد سے لے کر انٹرایکٹو سمیلیشنز اور آن لائن کورسز تک دریافت کرنے کے لیے بااختیار بنانا چاہتی ہے۔ ان ڈیجیٹل بنیادی ڈھانچے کے اقدامات کا بنیادی ہدف ایک زیادہ لچکدار اور موافقت پذیر سیکھنے کا ماحول بنانا بھی ہے۔ ٹکنالوجی کو اپنانے سے، تعلیمی نظام روایتی کلاس روم کی ترتیبات سے آگے بڑھ سکتے ہیں، ذاتی نوعیت کے اور خود رفتار سیکھنے کے تجربات فراہم کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف 21 ویں صدی کی عالمی معیشت کے تقاضوں کے مطابق ہے، بلکہ طلبا کو ڈیجیٹل دور کی طرف سے پیش کردہ چیلنجوں اور مواقع کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔

آن لائن اور بلنڈڈ لرننگ

یہ پالیسی تعلیمی نظام کے اندر آن لائن اور بلنڈڈ لرننگ کے ماڈل کی حمایت اور حوصلہ افزائی پر زور دیتی ہے۔ یہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں میں ڈیجیٹل پلیٹ فارم کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اس پالیسی کا ایک اہم پہلو تعلیمی مواد کی فراہمی میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے کردار کا اعتراف کے ساتھ ساتھ مواد کی ترسیل، تشخیص کے عمل اور سیکھنے کے طریقوں میں لچک میں اضافہ بھی ہے۔ اس سے مراد طلبا تک معلومات کی فراہمی کے لیے آن لائن وسائل، ڈیجیٹل مواد اور دیگر تکنیکی آلات کا استعمال ہے۔ مواد کی ترسیل میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے انضمام کا مقصد تعلیمی مواد کی رسائی اور دستیابی کو بڑھاتا ہے۔ مزید برآں، پالیسی تشخیص کے انعقاد میں ڈیجیٹل پلیٹ فارم کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اس میں طالب علم کی سمجھ اور کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے آن لائن تشخیص، خودکار درجہ بندی کے نظام، اور دیگر تکنیکی آلات کا استعمال شامل ہو سکتا ہے۔ ڈیجیٹل تشخیص کے طریقوں کی طرف تبدیلی تشخیص کے عمل میں کارکردگی، درستگی اور بروقت فیڈ بیک میں حصہ ڈال سکتی ہے۔ مزید برآں، پالیسی سیکھنے میں لچک کی ضرورت پر زور دیتی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کو ایک ذریعہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ آن لائن اور بلنڈڈ لرننگ کے ماڈل طلبا کو خود رفتار اور خود ہدایت سیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ لچک طلبا کو اپنی رفتار سے ترقی کرنے کی اجازت دیتی ہے اور ان کے انفرادی سیکھنے کے انداز اور ترجیحات کو مدنظر رکھتی ہے۔

> اس پہچان کی جڑ اس سمجھ میں ہے کہ جدید دنیا میں ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل مہارتیں تیزی سے اہم ہوگئی ہیں۔ نہ صرف کوڈنگ کو شامل کرنے کی حمایت کرتا ہے بلکہ کمپیوٹیشنل سوچ کے وسیع تر تصور پر بھی زور دیتی ہے۔ کمپیوٹیشنل سوچ میں مسئلہ حل کرنے کا طریقہ شامل ہے جو کمپیوٹر سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ افراد کو پیچیدہ مسائل کو چھوٹے، زیادہ قابل انتظام حصوں میں تقسیم کرنے اور منظم حل پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ای مواد کی ترقی

اعلیٰ معیار کے ڈیجیٹل مواد کے اہم کردار کو تسلیم کرتے ہوئے، یہ پالیسی تمام مضامین اور تعلیمی سطحوں پر مواد کی ترقی پر زور دیتی ہے۔ متعدد زبانوں میں مواد کی دستیابی کو یقینی بناتے ہوئے لسانی تنوع پر زور دیا گیا ہے۔ پالیسی سیکھنے کے تجربے کو بڑھانے کے لیے انٹرایکٹو مواد کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے، خاص طور پر دیہی اور محروم علاقوں کے طلبا کے لیے (پیرا 24.4 (ای) اور 24.5)۔

قومی پالیسی برائے تعلیم علاقائی زبانوں میں اعلیٰ معیار اور انٹرایکٹو الیکٹرانک مواد (ای-مواد) کی تخلیق کو فروغ دینے پر خاص زور دیتی ہے۔ اس توجہ کے پیچھے بنیادی مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ تعلیمی وسائل متعلمین کے وسیع اور متنوع گروپ کے لیے دستیاب ہوں۔ علاقائی زبانوں میں مواد کی ترقی کو ترجیح دیتے ہوئے، پالیسی کا مقصد لسانی تنوع کو حل کرنا اور مختلف خطوں میں سیکھنے والوں کے مختلف لسانی پس منظر کو پورا کرنا ہے۔ اعلیٰ معیار کے ای مواد کو فروغ دینے کا مطلب یہ ہے کہ تعلیمی وسائل کو اچھی طرح سے ڈیزائن، معلوماتی اور پرکشش ہونا چاہیے۔ اس میں سیکھنے کے مجموعی تجربے کو بڑھانے کے لیے ملٹی میڈیا عناصر، انٹرایکٹو فیچرز، اور ٹیکنالوجی سے بہتر فارمیٹس کا استعمال شامل ہو سکتا ہے۔ مقصد نہ صرف تعلیمی مواد کو قابل رسائی بنانا ہے بلکہ انھیں سیکھنے کی سہولت فراہم کرنے میں بھی موثر بنانا ہے۔ مزید برآں، علاقائی زبانوں پر زور شمولیت کے عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ مختلف کمیونٹیز کی طرف سے بولی جانے والی زبانوں میں تعلیمی مواد فراہم کرکے، زبان کی رکاوٹوں کو ختم کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ متنوع لسانی پس منظر کے سیکھنے والوں کو تعلیمی مواقع تک مساوی رسائی حاصل ہو۔ یہ نقطہ نظر جامع تعلیم کو فروغ دینے کے وسیع تر مقصد کے مطابق ہے، جہاں تمام طلبا، ان کے لسانی یا ثقافتی پس منظر سے قطع نظر، سیکھنے کے عمل میں مکمل طور پر حصہ لے سکتے ہیں۔

ڈیجیٹل تعلیم

یہ پالیسی ڈیجیٹل دور کے تقاضوں کے مطابق ہے، جس میں مستقبل پر مبنی ڈیجیٹل تدریس پر زور دیا گیا ہے۔ پالیسی اساتذہ کی تربیت، اختراعی طریقوں اور ذاتی نوعیت کے سیکھنے پر توجہ مرکوز کرتی ہے، سیکھنے کے ایک متحرک ماحول کا تصور کرتی ہے جہاں ٹیکنالوجی تعلیم کو بڑھاتی ہے۔ یہ ڈیجیٹل ٹولز میں اساتذہ کی استعداد کار میں اضافے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے والے جدید تدریسی طریقوں کی حمایت

کرتی ہے (پیرا 4.6، پیرا 24.5)۔

تعلیمی ٹیکنالوجی میں اساتذہ کی تربیت

ٹیکنالوجی سے چلنے والی تعلیم کے کامیاب نفاذ میں اساتذہ کے اہم کردار کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ پالیسی تعلیمی عمل میں ڈیجیٹل ٹولز اور پلیٹ فارم کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنے کے لیے اساتذہ کو ضروری مہارتوں اور علم سے آراستہ کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، اساتذہ کے لیے موزوں جامع تربیتی پروگراموں کے قیام کی سفارش کرتی ہے۔ ان پروگراموں کا مقصد اساتذہ کو مختلف ڈیجیٹل ٹولز اور پلیٹ فارمز کو ان کے تدریسی طریقوں میں نیوگیٹ کرنے اور ان کو مربوط کرنے کے لیے ضروری مہارت کے ساتھ بااختیار بنانا ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے پر زور دیا جاتا ہے کہ اساتذہ نہ صرف ٹیکنالوجی سے واقف ہوں بلکہ طلبا کے لیے سیکھنے کے مجموعی تجربے کو بڑھانے کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے میں بھی ماہر ہوں۔ مزید برآں، پالیسی اساتذہ کی تعلیم کے پروگراموں میں ٹیکنالوجی کے انضمام کا خاکہ پیش کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی سے متعلقہ اجزا کو نصاب اور تربیتی ماڈیولز میں بغیر کسی رکاوٹ کے شامل کیا جانا چاہیے جو خواہشمند اساتذہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔

سیکھنے کا عمل اور مصنوعی ذہانت

تعلیم کے شعبے میں انقلاب لانے میں لرننگ پلیٹ فارمز اور مصنوعی ذہانت کی نمایاں صلاحیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس پر زور دیتی ہے۔ اڈاپٹیو لرننگ پلیٹ فارمز ٹیکنالوجی پر مبنی نظاموں کا حوالہ دیتے ہیں جو انفرادی طلبا کی ضروریات اور پیش رفت کی بنیاد پر تدریسی مواد، رفتار اور تشخیص کو ایڈجسٹ کرتے ہیں۔ پالیسی تسلیم کرتی ہے کہ ذاتی نوعیت کے سیکھنے کے تجربات فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ انفرادی تعلیم میں ہر طالب علم کی منفرد ضروریات، صلاحیتوں اور سیکھنے کے انداز کے مطابق تعلیمی مواد اور طریقوں کو تیار کرنا شامل ہے۔ تعلیم میں کی ترقی اور تعیناتی کا محرک طلبا کے فائدے کے لیے تکنیکی ترقی کو استعمال کرنے کے عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کا استعمال طلبا کے سیکھنے کے نمونوں، ترجیحات اور کارکردگی پر ڈیٹا کی وسیع مقدار کا تجزیہ کرنے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ ڈیٹا پر مبنی یہ نقطہ نظر اساتذہ کو انفرادی طلبا کے لیے مشکل کے مخصوص شعبوں کو حل کرنے کے لیے اپنی مرضی کے مطابق سیکھنے کے راستے، اڈاپٹیو جائزے، اور ہدفی مداخلتیں بنانے کے قابل بناتا ہے۔ تعلیم میں ان کے انضمام کو فروغ دے کر، سیکھنے کے تجربات کے مجموعی معیار کو بڑھانا ہے۔ اس سے طلبا کی شرکت میں اضافہ ہوسکتا ہے، ان کی تعلیم کو بہتر بنایا جا سکتا ہے، اور ان کے تعلیمی نتائج کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ مزید برآں، انفرادی ضروریات کو پورا کرنے پر زور جامع اور مساوی تعلیمی نظام کو فروغ دینے کے وسیع مقصد کے مطابق ہے جو طلبا کی مختلف سیکھنے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

اوپن تعلیمی وسائل (OER)

اوپن تعلیمی وسائل ایسے تعلیمی مواد کا حوالہ دیتے ہیں جو آزادانہ طور پر قابل رسائی، کھلے عام لائسنس یافتہ، اور کسی کے لیے بھی استعمال کرنے، موافقت کرنے اور اشتراک کرنے کے لیے دستیاب ہیں۔ پالیسی کی ترقی اور تقسیم کی وکالت کرتے ہیں۔ سب سے پہلے، اس کا مقصد تعلیمی مواد کی تخلیق کو فروغ دینا ہے جو عوام کے لیے کھلے عام دستیاب ہو۔ اس میں ڈیجیٹل وسائل جیسے نصابی کتابیں، سبق کے منصوبے، ویڈیوز، اور دیگر سیکھنے کا مواد شامل ہے۔ ان وسائل کی کشادگی اساتذہ، طلبا اور عام لوگوں کو بغیر کسی لاگت کی رکاوٹوں کے ان تک رسائی، استعمال اور ان میں ترمیم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ دوم، پالیسی طلبا پر مالی بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ روایتی تعلیمی وسائل، جیسے نصابی کتابیں، مہنگی ہوسکتی ہیں اور تعلیم کی مجموعی لاگت میں نمایاں حصہ ڈال سکتی ہیں۔ آزادانہ طور پر دستیاب ڈیجیٹل وسائل کی ترقی اور استعمال کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، پالیسی کا مقصد طلبا پر مالی دباؤ کو کم کرنا، تعلیم کو مزید سستی اور قابل رسائی بنانا ہے۔ مزید برآں، آزادانہ طور پر دستیاب ڈیجیٹل وسائل پر زور سیکھنے کے مواد تک رسائی کو بڑھانے کے وسیع تر مقصد کے مطابق ہے۔ بہت سے تعلیمی نظاموں میں، کچھ طلبا کو مالی مجبوریوں کی وجہ سے نصابی کتب اور دیگر ضروری مواد تک رسائی میں چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

تعلیمی ٹیکنالوجی ریسرچ اینڈ انوویشن

تعلیمی ٹیکنالوجی کے میدان میں تحقیق اور جدت طرازی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے، اس کا مقصد جدید ٹیکنالوجیز اور حل کی تخلیق اور نفاذ کو فروغ دینا ہے جو تعلیم کے میدان میں موجود مختلف چیلنجوں سے مؤثر طریقے سے نمٹتے ہیں۔ نہ صرف تعلیمی نظام میں ٹیکنالوجی کو شامل کرنے پر زور دیا جاتا ہے بلکہ طلبا کے لیے سیکھنے کے مجموعی تجربے اور نتائج میں واضح بہتری لانے کے لیے اس کا فائدہ اٹھانا بھی ہے۔ تعلیمی منظرنامے کی متحرک نوعیت کو تسلیم کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ تکنیکی ترقی سیکھنے کے مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ جدید ترین ٹیکنالوجیز، ٹولز اور طریقہ کار کی تلاش اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو روایتی تدریس اور سیکھنے کے طریقوں میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عملی طور پر، اس تعلیمی چیلنج میں ڈیجیٹل لرننگ پلیٹ فارمز، انٹرایکٹو تعلیمی مواد، انکولی سیکھنے کے نظام، اور دیگر تکنیکی مداخلتیں شامل ہوسکتی ہیں جو سیکھنے کے متنوع انداز اور ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ مزید برآں، اساتذہ، محققین اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کے درمیان تعاون کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ تعلیمی اختراع کے لیے ایک ہم آہنگی کا نقطہ نظر پیدا کیا جا سکے۔ تعلیم کے شعبے کو درپیش کثیر الجہتی مسائل کو حل کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کی مکمل صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لیے یہ باہمی کوشش اہم ہے۔

لچکدار کریڈٹ ٹرانسفر اور آن لائن امتحانات

پالیسی میں ایک لچکدار کریڈٹ ٹرانسفر سسٹم کو اپنانے کی تجویز دی گئی ہے، جو تعلیمی اداروں کے درمیان تعلیمی کریڈٹ کی بغیر کسی رکاوٹ کے نقل و حرکت کو آسان بنانے کے لیے ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھائے گی۔ اس نظام کا مقصد طالب علموں کو تعلیم کے لیے کثیر الشعبہ نقطہ نظر کو اپنانے کا موقع فراہم کر کے بااختیار بنانا ہے۔ مختصراً طلبا کے پاس مختلف شعبوں اور اداروں سے کورسز کا انتخاب کرنے کی لچک ہوگی، جس سے انھیں مزید ذاتی نوعیت کا اور متنوع سیکھنے کا تجربہ حاصل ہوگا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا استعمال اس پالیسی کا ایک اہم جز ہے، کیونکہ یہ کریڈٹ ٹرانسفر کے عمل کو ہموار کرے گا، اسے مزید موثر اور قابل رسائی بنائے گا۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے ذریعے، طلبا اپنے تعلیمی کریڈٹ کو آسانی سے ٹریک اور منتقل کر سکتے ہیں، انتظامی بوجھ کو کم کر کے اور تعلیمی پروگراموں کے درمیان بغیر کسی رکاوٹ کے منتقلی

کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ مزید برآں، پالیسی محفوظ اور موثر آن لائن امتحانات کی حمایت کرتے ہوئے تشخیصی عمل میں ٹیکنالوجی کے انضمام پر زور دیتی ہے۔ اس سے تشخیص کے طریقوں کو جدید بنانے کی طرف ایک اقدام تجویز کیا گیا ہے، جو ممکنہ طور پر طالب علموں کو دور سے امتحان دینے کی اجازت دیتی ہے۔ امتحانات میں ٹیکنالوجی کا استعمال نہ صرف سہولت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ طلبا میں ڈیجیٹل مہارتوں کی نشوونما کو بھی فروغ دیتی ہے۔

کوڈنگ اور کمپیوٹیشنل سوچ کو فروغ

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں کوڈنگ اور کمپیوٹیشنل سوچ کو شامل کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس پہچان کی جڑ اس سمجھ میں ہے کہ جدید دنیا میں ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل مہارتیں تیزی سے اہم ہوگئی ہیں۔ نہ صرف کوڈنگ کو شامل کرنے کی حمایت کرتا ہے بلکہ کمپیوٹیشنل سوچ کے وسیع تر تصور پر بھی زور دیتی ہے۔ کمپیوٹیشنل سوچ میں مسئلہ حل کرنے کا طریقہ شامل ہے جو کمپیوٹر سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ افراد کو پیچیدہ مسائل کو چھوٹے، زیادہ قابل انتظام حصوں میں تقسیم کرنے اور منظم حل پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ کوڈنگ اور کمپیوٹیشنل سوچ کو اسکول کے نصاب میں ضم کرکے، کا مقصد طلبا کو ٹیکنالوجی سے چلنے والے بڑھتے ہوئے معاشرے کو نیویگیٹ کرنے کے لیے درکار مہارتوں سے آراستہ کرنا ہے۔ مزید برآں، مختلف شعبوں بشمول مسائل حل کرنے، تنقیدی سوچ اور ڈیجیٹل خواندگی سمیت طلبا کی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال کی وکالت کرتا ہے۔ یہ نقطہ نظر تسلیم کرتا ہے کہ ٹیکنالوجی طلبا کو مشغول کرنے اور سیکھنے کے متحرک ماحول کو آسان بنانے کے لیے ایک طاقتور ٹول کے طور پر کام کرسکتی ہے۔ ٹکنالوجی کو شامل کرکے، تعلیمی نظام طلبا کو تیزی سے تیار ہوتے ڈیجیٹل منظرنامے کے ذریعے پیش کردہ چیلنجوں اور مواقع کے لیے بہتر طریقے سے تیار کرسکتے ہیں۔

ورچوئل لیبز اور سمولیشن

فزیکل لیبارٹریوں تک محدود رسائی سے نمٹنے کے لیے، خاص طور پر دور دراز علاقوں میں، ورچوئل لیبز اور سمولیشنز کی ترقی کی سفارش کرتا ہے۔ یہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تمام طلبا، بشمول سماجی و اقتصادی طور پر

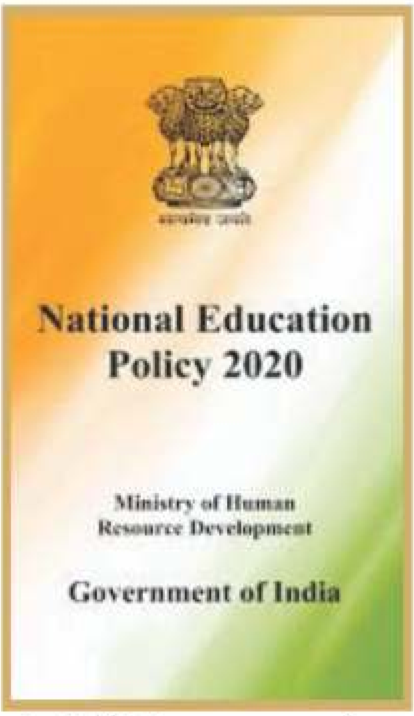

پسماندہ گروپوں (SEDGs) کے، کو عملی سیکھنے کے تجربات تک یکساں رسائی حاصل ہے۔ موجودہ ای لرننگ پلیٹ فارمز کو مناسب ڈیجیٹل آلات (پیرا24.4(f)) کے ذریعے رسائی فراہم کرنے کے لیے تلاش کیا جائے گا۔

آن لائن تشخیص

تعلیم کے معیار اور رسائی کو بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی کے ذریعے سہولت فراہم کی گئی آن لائن تشخیص کے وژن کے مطابق ہے۔ یہ مختلف مقامات کے طلبا کو جسمانی بنیادی ڈھانچے کی ضروریات کے بغیر معیاری تشخیص میں حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ انکولی آن لائن تشخیص سوالات کو انفرادی صلاحیتوں کے مطابق بناتا ہے، اس طرح ذاتی نوعیت کے سیکھنے کی حمایت کرتا ہے (پیرا24.4(h))۔

شمولیت اور رسائی

جامع اور قابل رسائی تعلیم کے لیے ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے لیے پرعزم ہے۔ سفارشات میں اسکرین ریڈرز اور کیپشنگ جیسی خصوصیات کے ساتھ قابل رسائی ڈیجیٹل مواد بنانا، معاون ٹیکنالوجیز کو شامل کرنا، اور موافقت پذیر سیکھنے کے راستوں کو فروغ دینا شامل ہے۔ پالیسی زبان کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور ثقافتی تنوع کو محفوظ رکھنے کے لیے کثیر لسانی ڈیجیٹل مواد پر زور دیتی ہے (پیرا6.1، پیرا6.11، پیرا24.4(c)، پیرا4.14)۔

اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی

اساتذہ کے اہم کردار کو تسلیم کرتا ہے اور مسلسل پیشہ ورانہ ترقی پر زور دیتی ہے۔ سفارشات میں اساتذہ کی ڈیجیٹل خواندگی کو بڑھانے کے لیے باقاعدہ تربیتی پروگرام، تعلیمی ٹیکنالوجی کے استعمال میں مہارت اور جدید تدریسی طریق کار شامل ہیں۔ پلیٹ فارم کو اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی میں ای مواد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے (پیرا24.5(جی)، پیرا23.6)۔

ابھرتی ہوئی اور خلل ڈالنے والی ٹیکنالوجیز

تعلیم میں ابھرتی ہوئی اور خلل ڈالنے والی ٹیکنالوجیز ایسے جدید آلات اور طریقوں کا حوالہ دیتی ہیں جو روایتی تعلیمی منظرنامے کو نمایاں طور پر تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ٹیکنالوجیز اکثر تدریس، سیکھنے، اور انتظامیہ کے نئے طریقے متعارف کراتی ہیں، جس سے زیادہ متحرک اور متعامل تعلیمی تجربہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کی قومی پالیسی برائے تعلیم تعلیم کے منظرنامے کو نئی شکل دینے میں مصنوعی ذہانت روبوٹکس، 3D پرنٹنگ، سمولیشن اور دیگر جیسی خلل ڈالنے والی ٹیکنالوجیز کی تبدیلی کی صلاحیت کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ ٹیکنالوجیز طلبا کے سیکھنے، اساتذہ کے پڑھانے اور تعلیمی اداروں کے کام کرنے کے طریقے میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ان خلل ڈالنے والی ٹیکنالوجیز کا انضمام کی تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیتوں اور مضامین کی جامع تفہیم کو فروغ دینے کے وژن کے مطابق ہے۔ مزید برآں، یہ ٹیکنالوجیز معیاری تعلیم تک رسائی کے خلا کو پر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جس سے متنوع پس منظر سے تعلق رکھنے والے طلبا کے لیے مزید جامع اور مساوی سیکھنے کے تجربے کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے نفاذ کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، خلل ڈالنے والی ٹکنالوجیوں کا اسٹریٹجک انضمام تعلیمی منظرنامے کو نئے سرے سے متعین کرنے کے لیے، طلبہ کو 21ویں صدی کے چیلنجوں اور مواقع کے لیے تیار کرنے کے لیے تیار ہے۔

■

Dr. Mohd Mamoor Ali
Asst Professor, Dept of Teacher Training & Non Formal Education (IASE)
Faculty of Education, Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9958262877
mmamur@jmi.ac.in

ادب پر اساطیر اور مہماتی قصوں کا اطلاق

ناز قادری

وہ تہذیبیں زیادہ تخلیقیت اور بارآوری کی حامل ہوتی ہیں جن کے پاس اساطیر کا بیش بہا خزانہ ہوتا ہے۔ ادب وفنون کے علاوہ کئی دیگر علومِ انسانیہ پر اساطیری بصیرت کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ دراصل یہ علامتیں ہیں یا یہ کہا جائے کہ ثقافتی علامتیں ہیں۔ دنیا کی مختلف ثقافتوں کے مطالعے میں اساطیری علامتوں کی خاص اہمیت ہے۔ کیونکہ کوئی تہذیب خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک انسانی گروے اور ایک خاص جغرافیائی وحدت میں وہ نشو ونما پاتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اساطیری مطالعے سے ان تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے انسانی گروہوں کی افتادِ طبع، ان کی اخلاقیات، ان کی ذہنی زندگی اور ان کے نظریات وعقائد کا پتہ لگا سکتے ہیں بلکہ تہذیبی مطالعے سے بھی ہم ان اساطیری جڑوں تک پہنچ سکتے ہیں جن کا ایک وسیع پس منظر ہوتا ہے اور جو تخیلاتی پیداوار ہونے کے باوجود انسان کا ایک محل اور ہمیشہ قائم رہنے والی معنویت ہوتی ہے۔ انور صدیقی نے اشاریت کی تہذیبی بنیادوں کے ذیل میں علامتوں کی تخلیق کو ثقافتی عمل قرار دیتے ہوئے ان کے اساطیری رشتے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

اشاروں اور علامتوں کی تخلیق و تزئین ایک تہذیبی عمل ہے۔ کسی تہذیب کی ترقی پذیری یا انحطاط کا مطالعہ اس خاص تہذیب کی اشاریت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ علامتیں ثقافت کی روح کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ بڑے شاعروں کی طرح تہذیبیں بھی اشاروں میں بولتی ہیں اور اپنے عزائم، اپنے احساس کے سارے اضطراب اور وجدانی مطالبوں کا اظہار علامتوں میں کرتی ہیں اور روحِ تہذیب کی صورت گری کا نام شاعری ہے۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر تہذیب اپنی افتادِ طبع، مزاج اور عقائد کے اعتبار سے علامتیں اور اساطیر وضع کرتی ہے اور جب اس تہذیب پر کسی دوسری تہذیب کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں یا وہ غروب ہونے لگتی ہے تو پہلے ایک خاموش اور غیر محسوس تبدیلی اس کے بطون میں دبے پاؤں رینگ آتی ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار سب سے پہلے فنونِ لطیفہ میں نئی ابھرنے والی علامتیں کرتی ہیں... وہ تہذیبیں جن کی دیومالائیں اور اساطیر ہیں بہترین خلاق تہذیبیں ہیں۔ تصویروں اور تمثالوں میں سوچنے والی تہذیبیں اسی انداز سے سوچنے والے فنکاروں کی طرح بڑی پر عظمت ہوتی ہیں۔ کائنات کی میکانکی توجیہ، تشریح یا میکانکی نظریہ کبھی کسی بڑے ادب یا بڑی تہذیب کو جنم نہیں دے سکتا۔[1]

لیوی اسٹراس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف Structural Anthropology میں لوک کہانی، اسطوری کہانی کی جڑوں تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ بنیادی طور پر اس کا یہی خیال ہے۔ ہر ثقافت کی بنیاد اس کے نظامِ اساطیر میں دستیاب ہے۔ اس طریقے سے وہ انسانی ذہن کی جڑوں تک پہنچتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ قدیم تہذیبی نظاموں میں رائج اوہام، رسومات، تہوار اور تقریبات ایک مربوط سماجی نظم وضبط کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیوی اسٹراس نے The Savage Mind میں متھ کو محض خیالی پرواز سے موسوم نہیں کیا بلکہ اسے a kind of thought ایک خیال، ایک پیغام سے تعبیر کیا ہے جس کی اساس halfway between percepts and concepts کے عناصر پر ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی تصنیف 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' میں لیوی اسٹراس کے اس خیال کی ان لفظوں میں وضاحت کی ہے کہ:

متھ ایک طرح کا پیغام ہے جو اس ثقافت کے افراد کے لیے ہے جس ثقافت میں وہ متھ رائج ہے۔ مزید یہ کہ جب تک کوئی ثقافت وحدانی رہتی ہے۔ متھ میں تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن جب اس میں دوسرے اثرات کے در آنے سے مختلف پرتیں پیدا ہوتی ہیں تو متھ میں بھی تبدیلیاں نمودار ہوجاتی ہیں۔ تاہم متھ کا اصل پیغام نہیں بدلتا بلکہ یہ وہی رہتا ہے۔[2]

قبائلی بصیرت

اساطیر کے بارے میں اس خیال سے اب کم ہی متفق ہیں کہ بصیرت یا محسوسات سے یہ بے بہرہ ہوتے

ہیں۔ قبائلی انسان جس طور پر علامتوں میں سوچتا تھا اور جس طور پر کائنات فطرت اور وجود کے پیچھے مخفی اسرار تک پہنچنے کی جستجو کرتا تھا اس کا اظہار اساطیری کہانیوں میں ہوا ہے۔ قبائلی انسان ان اساطیر اور سورماؤں کی کہانیوں (لیجنڈ) میں انکشاف کے طور پر ان حقائق کو پیش کرتا تھا۔ ان کے محسوسات اور ان کے جذبات بھی فطرت ہی کی طرح بے میل اور شفاف تھے۔ صنعتی تہذیب کے تحفظات نے ان کے تخیل کی آزادروی پر حد بندیاں قائم نہیں کی تھیں۔ کانٹ بھی یہی کہتا ہے کہ انسانی ذہن کوئی مجہول آئینہ نہیں ہے جس کا کام ہی ہر اس چیز کا عکس مہیا کرنا ہے جو اس کے سامنے موجود ہوتا ہے بلکہ انسانی ذہن ایک فعال قوت ہے جو کسی چیز کا عکس مہیا نہیں کرتا بلکہ اپنے طور پر اس حقیقت پر اثر انداز بھی ہوتا ہے یعنی اس حقیقت کو ایک نئی شکل بھی مہیا کرتا ہے جس کا ہم ادراک کرتے ہیں۔ اس معنی میں قبائلی انسان کے علامتیانے کا عمل نہ تو مہمل اور لایعنی ہے اور نہ طفلانہ childish۔ اس عمل کے پیچھے ان کے اپنے میلانات ہوتے ہیں جو اپنے طور پر 'صداقت' کا تعین کرتے ہیں۔ یعنی ان کی سچائیاں ان کے ذہنی اور ثقافتی تناظر کی کوکھ سے برآمد ہوتی ہیں۔ جن کے کوئی ایک معنی نہیں ہوتے جیسا کہ علامت کے کوئی ایک معنی نہیں ہوتے بلکہ علامتی تصورات ہمیشہ بڑھتے اور پھیلتے ہیں وہ جامد اور ساکن نہیں ہوتے جس طرح عموماً لغوی معنی اور مفاہیم ہوتے ہیں۔

اساطیر اور تمثیل allegory

اساطیر کی ایک تمثیلی جہت بھی ہوتی ہے۔ اس معنی میں اس کی تشکیل استعارے کی مرہون ہوتی ہے۔ استعارہ حقیقت کو ایک نئے معنی مہیا کرنے کا نام ہے۔ وہ حقیقت کو رد نہیں کرتا بلکہ حقیقت کے اور دوسرے بہت سے نام ممکن ہیں۔ ان ممکنات پر سے وہ پردہ اٹھاتا ہے۔ جس طرح تمثیلی قصہ یا داستان دوران محض میں واقع ہوتی ہے اسی طرح اساطیری کہانی میں بھی زمان کا تعین ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ اساطیر کی تمثیلی تشریحات بھی کی جاتی رہی ہیں۔ ان کے اندر کارفرما علامتی اور استعاراتی معنی کو بھی بحث کا موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی اہم تالیف 'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ' میں تمثیل (allegory) کے ضمن میں اسطور اور تمثیل، اسطور اور اجتماعی حافظہ، اسطور اور اخلاقی اصول سازی، اسطور اور قوتوں کی نمائندگی پر تجزیاتی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسان نے اپنی بیش بہا اور فطری تمثیلی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر ان اشیا کو حرکت میں بدل دیا جو مجہول تھیں۔ انھیں مجرّ کر دکھایا جو مجرد تھیں یا محض کیفیات و اوصاف سے جن کا تعلق تھا۔ ان جانوروں اور اشیا کو زبان دے دی گئی جو غیر ناطق تھیں۔ آہستہ آہستہ اساطیر نے انفرادی اور اجتماعی حافظے میں اپنی جڑیں گہری کرلیں۔ اعادے اور تکرار، نیز زمانہ بہ زمانہ فاصلوں میں اضافے کے باعث ان کی اصلیتیں بھی تبدیل ہوتی رہیں اور مختلف قوموں، قبیلوں اور فرقوں میں ان کی حیثیت اخلاق رہ نما کی ہوگئی۔ بعد ازاں یہود نے سب سے پہلے اسطور پر ضرب لگائی تاہم اسطوری دانش کا فیضان جاری رہا۔ مذاہب نے انھیں خرافات کا نام دیا لیکن ان سے اپنے اصول بھی وضع کیے۔ اس طور پر اساطیر کی علامتی معنویتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اب وہ محض ایسے مظاہر میں بدل گئے ہیں جو انسانی حقائق اور قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔[3]

انسان نے اپنی بیش بہا اور فطری تمثیلی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر ان اشیا کو حرکت میں بدل دیا جو مجہول تھیں۔ انھیں مجرّ کر دکھایا جو مجرد تھیں یا محض کیفیات و اوصاف سے جن کا تعلق تھا۔ ان جانوروں اور اشیا کو زبان دے دی گئی جو غیر ناطق تھیں۔ آہستہ آہستہ اساطیر نے انفرادی اور اجتماعی حافظے میں اپنی جڑیں گہری کرلیں۔

اسطور کی علامتی توضیح

جیسا کہ اس سے قبل یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اسطوری کہانیاں اور اسطوری کردار محض خیالی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ استعارے اور علامت کی طرح ان کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ظاہری سطح پر جس معنی سے ہم دوچار ہوتے ہیں معنی کا وہ محض ایک پہلو بلکہ ایک جھلک (flash) ہوتی ہے۔ جب کہ اصل معنی اس کے نیچے اور نیچے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس معنی میں اضافی ہوتے ہیں کہ علامتی معنی کی خاصیت ہی اس کا حرکی کردار ہے۔ وہ کسی ایک تصور پر قانع نہیں ہوتی اور نہ متوازیت کے معنی میں دونوں معنی ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں۔ اکثر پہلی پرت کے معنی کو دوسری پرت کے معنی رد بھی کرتے ہیں۔ قبائلی انسان کی علامتیت پر سب سے پہلے وائکو (Vico) نے دانشورانہ نوعیت کی روشنی ڈالی تھی، وائکو ہی کے خیالات کی توسیع بشریات اور نفسیات کے علما کی جدید ترین تحقیقات میں ملتی ہیں۔ علوم کے ان میدانوں میں وائکو کو کئی اعتبار سے بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ ارنسٹ کیسرر نے بھی اپنی تصنیف Philosophy of Symbolic Forms میں زبان اور اسطور کے ماخذ پر بحث کرتے ہوئے ان کی علامتی معنویت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس کی نظر میں زبان اور علامت نے ایک ہی زمین سے نمو پائی ہے۔ (two diverse shoots from the some parent stem) گویا علامتی تشکیل میں دونوں کا محرک ایک ہی ہے۔ وہ واضح لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ علامتیں انسانوں کی ضروریات اور مقاصد کے مطابق اپنی شکل بناتی ہیں۔ علامت میں کسی حقیقت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا بلکہ وہ خود حقیقت ہوتی ہے۔ علامت میں موضوع اور معروض کے درمیان ایک اندر ہی اندر رواں شناخت کی صورت ہوتی ہے۔ یعنی علامت موضوع اور معروض کے مابین ایک 'مقام ملاقات meeting place' ہے۔ کیسرر نے شعری اظہار اور سائنس کی زبان کے تعلق پر جو بحث کی ہے۔ ڈبلیو۔ ایم۔ اربن نے اپنی تصنیف Language and Reality میں اسطور کو بنیاد بنایا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کیسرر سے اختلاف بھی کیا ہے۔ وہ مابعد الطبیعیات کو علامتی زبان کے طور پر اخذ کرتا ہے جو سائنس اور فن کی علامتی زبانوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔

نارتھروپ فرائی نے کیسرر اور سوزان کے لینگر کے اساطیری علامتی نظام کے تصور کو اپنی تصنیف The Anantomy of Criticism میں بحث کا موضوع بنایا ہے۔کیسرر اور لینگر نے شاعری اور متھ کے فرق کو بنیاد بنایا تھا جب کہ فرائی دونوں کے انضمام پر زور دیتا ہے۔

اسطور اور دوسرے علوم و مکاتب

اساطیر بہ یک وقت کئی علوم پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اساطیر کی علامتی جہتوں سے کئی جدید علوم نے اپنی تحقیقات میں مدد لی ہے۔ تحلیل نفسی اساطیری مفاہیم کو خصوصی طور پر آفاقی نفسی تصادمات کے مظہر کے طور پر اخذ کرتی ہے جس کی بہترین مثال ایڈی پس کامپلیکس کی ہے۔سی۔ جے۔ یونگ نے محض اساطیر کے مطالعے ہی کو بنیاد بنا کر اپنے تصورات قائم نہیں کیے بلکہ خوابوں، مذہب اور فن کی مثالوں سے آرکی ٹائپ کا تصور قائم کیا۔ جسے وہ آفاقی تشکیلی عملیے کی بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ یہ عملیہ Process ہی اساطیر کی تشکیل وتعمیر کرتا ہے۔تہذیبی بشریات کی رو سے اساطیر سوسائٹی کی یک جہتی اور ہم آہنگی کو مستحکم کرنے کی سب سے بڑی طاقت اور ذریعہ ہوتے ہیں۔ درخیم نے سماجی مطالعات میں اساطیر کو اجتماعی ضمیر کا مظہر کہا ہے۔ یہ وہ اصول اور شعائر ہوتے ہیں جن سے روشنی اخذ کر کے افراد سماجی بنتے ہیں اور جو صنعتی دور سے پہلے اور بعد کی سوسائٹیوں میں مضبوط رشتہ قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔فرانسیسی مارکسی فلسفی جیورجس سوریل کی تصنیف Reflection on Vilence (1907) میں وہ عصری سیاست اور سماجی واقعات کو طاقتور اساطیر کے طور پر اخذ کرتا ہے۔(جیسے عام ہڑتال)۔اس قسم کے اساطیر لازماً عوامی سیاسی عمل کے لیے تحریک کا باعث بننے والے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں۔

تہذیبی بشریات کی رو سے اساطیر سوسائٹی کی یک جہتی اور ہم آہنگی کو مستحکم کرنے کی سب سے بڑی طاقت اور ذریعہ ہوتے ہیں۔ درخیم نے سماجی مطالعات میں اساطیر کو اجتماعی ضمیر کا مظہر کہا ہے۔ یہ وہ اصول اور شعائر ہوتے ہیں جن سے روشنی اخذ کر کے افراد سماجی بنتے ہیں اور جو صنعتی دور سے پہلے اور بعد کی سوسائٹیوں میں مضبوط رشتہ قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

لیوی اسٹراس ساختیاتی بشریات میں سوسیئر کی نشانیات کی تھیوری پر اساس رکھتا ہے۔ وہ اساطیر کو نشانیاتی نظام کے طور پر مانتا ہے۔ وہ ان اصولوں کی تحقیق کرتا ہے کہ کس طرح ایک اسطور دوسرے اسطور کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ بعدازاں رولاں بارتھ نے بھی اسطور کو اپنے تجزیے میں ایک اوزار کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح اس نے اسطور اور عصری تہذیب کے باہمی ربط کو حوالہ بنایا ہے۔ اسٹراس کا کہنا ہے کہ نشان sign اسطور کو مجسم کرتا ہے اور مجرد تصورات کو ایک خاص اظہار کی صورت بخشتا ہے۔

اسطور اور نفسیات

سگمنڈ فرونڈ وہ پہلا نفسیات داں ہے جس نے اپنی تحقیقات اور نفسیاتی تجربات ونتائج کو مستحکم کرنے کے لیے اساطیر سے جابجا کام لیا ہے اس سلسلے میں اس کی معرکۃ الآرا تصنیف The Interpretation of Dreams کا خاص مقام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بچے میں اپنی ماں کے لیے زبردست دبی کچلی خواہش ہوتی ہے۔ باپ اس کی راہ میں ایک ایسی رکاوٹ ہوتا ہے جسے وہ ہٹا کر ماں پر پورا اختیار چاہتا ہے۔ اسے وہ Oedipus Complex کہتا ہے۔ اسی طرح لڑکی کے اندر بھی باپ کے لیے اسی قسم کی نفسی خواہش ہوتی ہے جسے فرونڈ Electra Complex کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس مظہرے Phenomenon کو خوابوں، اساطیر، پریوں کی کہانیوں، لوک قصوں اور حتیٰ کہ لطائف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فرونڈ نے Oedipus اور Electra جیسے کردار اساطیر ہی سے اخذ کیے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> Myth was the distorted wish-dreams of entire people

اساطیر تمام انسانوں کے ٹوٹے پھوٹے خواہش بیز خواب ہیں۔

اسی بنا پر فرونڈ کا خیال ہے کہ خواہش کی راہ میں رکاوٹ کے باعث بچہ باپ سے بغاوت پر آمادہ ہوتا اور اسے قتل کرنے کے درپے بھی ہو جاتا ہے اور ایڈی پس کی طرح اپنی ماں کو لے کر فرار بھی ہو سکتا ہے۔

جے۔ اے۔ اٹکنسن کی مرتبہ 'ڈکشنری آف سائیکلوجی' میں ایڈی پس کامپلیکس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

> The child's repressed desires for sexual intercourse with the parent of the opposite sex. Originally Freud used the term Odepus Complex to refer the boy's desire for the mother, and the term Electra Complex to refer to the corresponding desire of the girl for the father. More recently, psychoanalysts use Oedepus Complex to refer to both sexes. 4

ترجمہ: مرد بچے کی اپنے مخالف جنس والدین کے ساتھ جنسی عمل کی شدید خواہش۔ بنیادی طور پر فرونڈ نے ایڈی پس کامپلیکس کی اصطلاح کو صرف مرد بچے کی اس خواہش کو مدنظر رکھ کر کیا تھا جو وہ ماں کے تعلق سے رکھتا ہے اور الیکٹرا کامپلیکس کو اسی معنی میں لڑکیوں کی اس خواہش سے وابستہ کیا جس کا مرکز باپ ہوتا ہے۔ جدید ترین نفسیات داں اب دونوں یعنی لڑکی اور لڑکے کے لیے ایڈی پس کامپلیکس کی اصطلاح ہی استعمال کرتے ہیں۔

فرونڈ نے یہ اصطلاح سوفوکلیز کے شہرۂ آفاق المیہ 'ایڈی پس دی کنگ' سے لی تھی جس میں ایڈی پس کے ذریعے نادانستہ طور پر اس کے باپ کا قتل ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ اسطوری ادوار ہی میں نہیں عہد وسطیٰ اور اس کے بعد کے شہنشاہیت کے زمانوں میں بھی فاتح بادشاہ مفتوح ملکاؤں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ ایڈی پس بھی لاعلمی میں باپ کے قتل اور ماں سے شادی کر کے ایک عمومی سماجی اخلاقی

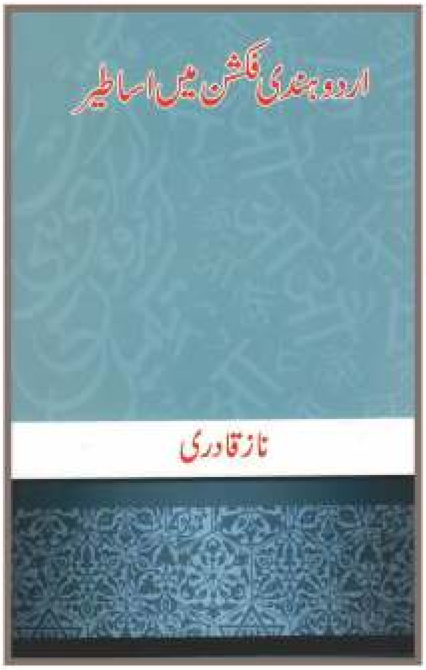

قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے جو بالآخر اس کے لیے بہت بڑے عذاب کا سبب بھی بنتا ہے۔

ایڈی پس کے بارے میں یہ اسطوری کہانی مشہور ہے کہ تھیبس کے بادشاہ لایوس (Lauis) کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں کا نام ملکہ جوکاسٹا تھا۔ لایوس کے ایک گناہ کی پاداش میں اسے یہ بشارت دی گئی تھی کہ اس کی موت اس کے بیٹے کے ہاتھوں ہوگی۔ برسوں تک وہ اپنی بیوی سے فاصلہ بنا کے رکھتا ہے لیکن ایک روز نشے کے عالم میں وہ مجامعت کر بیٹھتا ہے۔ ایڈی پس اسی کا ثمر تھا۔ ایڈی پس کے پیدا ہونے پر لایوس اس کے پاؤں چھید کر اسے دور ایک پہاڑ پر مرنے کے لیے پھینک دیتا ہے۔ ایک چرواہے کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے وہ اسے کورنتھ کے بادشاہ پولی بس کے سپرد کر دیتا ہے جو لاولد تھا۔ چونکہ ایڈی پس کا پیر مخدوش تھا۔ اس لیے وہ اس کا نام ایڈی پس رکھتا ہے جس کے معنی سوجے ہوئے (متورّم) کے ہوتے ہیں۔ بڑے ہو کر اس کی جنگ تھیبس کے بادشاہ لایوس (اس کے باپ) سے ہوتی ہے جو مارا جاتا ہے اور ایڈی پس لاعلمی میں اپنی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ جوکاسٹا کے بطن سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی اثنا میں تھیبس میں پلیگ کی بیماری پھیل جاتی ہے۔ ہزاروں انسانوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ لایوس، کریون، کو ڈیلفی کے مندر بھیجتا ہے۔ غیب سے یہ جاننے کے لیے کہ اس تباہی کی وجہ کیا ہے۔ یہ کس گناہ کی پاداش میں آسمانی عتاب نازل ہوا ہے، ٹائیرے سس (Tiresias) نامی ایک بزرگ ایڈی پس کو گناہ گار بتاتے ہیں۔ ایڈی پس کے لیے یہ خبر ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے اور تھیبس کو چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جوکاسٹا خودکشی کر لیتی ہے۔ ایڈی پس کی بیٹی اینٹی گنی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ایتھنس کے قریب کولونس کے مقام پر اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ ایتھنس کے باشندوں کے لیے ایڈی پس کی موت کی خبر ایک خوش شگونی کے مترادف تھی۔ اس کی موت پر عوامی جشن منائے جاتے ہیں۔

فرائڈ نے ایڈی پس کی طرح الیکٹرا کی اصطلاح بھی یونانی اسطور سے حاصل کی ہے۔ الیکٹرا، اگامینن کی بیٹی تھی جو مائی سینائے Mycenae کا بادشاہ تھا۔ الیکٹرا کے معنی ہیں 'آگ' چمک یا بجلی۔ جب اگامینن ٹرائے کی جنگ سے لوٹا تو اس کی بیوی اپنے عاشق ایگس تھس Aegisthus کے ساتھ مل کر اسے قتل کر دیتی ہے۔ الیکٹرا کو ایگس تھس کے قاتلانہ ارادوں سے واقف تھی وہ اس کے ظلم سے اپنے بھائی اوریس ٹس Orestus کو بچا کر انھیں وہاں سے دور روانہ کر دیتی ہے۔ برسہابرس کے بعد اوریس ٹس مائی سینائے لوٹتا ہے۔ دونوں بہن بھائی باپ کی قبر پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

فرونڈ نے ایڈی پس کی طرح الیکٹرا کی اصطلاح بھی یونانی اسطور سے حاصل کی ہے۔ الیکٹرا، اگامینن کی بیٹی تھی جو مائی سینائے Mycenae کا بادشاہ تھا۔ الیکٹرا کے معنی ہیں 'آگ' چمک یا بجلی۔ جب اگامینن ٹرائے کی جنگ سے لوٹا تو اس کی بیوی اپنے عاشق ایگس تھس Aegisthus کے ساتھ مل کر اسے قتل کردیتی ہے۔ الیکٹرا کو ایگس تھس کے قاتلانہ ارادوں سے واقف تھی وہ اس کے ظلم سے اپنے بھائی اوریس ٹس Orestus کو بچا کر انھیں وہاں سے دور روانہ کردیتی ہے۔ برسہابرس کے بعد اوریس ٹس مائی سینائے لوٹتا ہے۔ دونوں بھن بھائی باپ کی قبر پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

لیوی بروہل اور جے۔ سی۔ یونگ کے اسطوری تصورات فرائڈ کے مقابلے میں زیادہ مثبت اور تخلیقی ہیں۔ بروہل بھی اسطور کو پس منطقی Pre-logical ذہانت کی اختراع مانتے ہوئے ایک ایسے طریق فکر سے منسوب کرتا ہے جو قدیم انسانوں میں عمومیت کا درجہ رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانوں میں جہاں جہاں قبائلی گروہ اپنے اپنے حدود میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں بھی سوچنے کا یہ ڈھنگ عام ہے۔ ان کی اس سوچ میں ایک mystical participation سرّی شمولیت کی جھلک کا بھی تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ موضوع اور معروض کو ایک ہی وحدت میں دیکھتے اور سوچتے ہیں۔ یونگ نے اساطیر ہی سے 'اجتماعی لاشعور' کا تصور اخذ کیا۔ اسی طرح اس کے آرکی ٹائپس (archetypes) کے تصور کی جڑیں بھی اساطیری نظام ہی میں پیوست ہیں۔ آرکی ٹائپس بنیادی قیاسات ہیں۔ وہ ان کا رشتہ اساطیر، پریوں کی کہانیوں اور خوابوں سے جوڑتا ہے۔ جو تمام انسانوں کی سائیکی میں مشترک ہیں۔

حواشی

1 انور صدیقی: ساخت و شناخت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1993
2 گوپی چند نارنگ 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایجوکیشنل ہاؤس دہلی، 1993، ص 115
3 پروفیسر عتیق اللہ 'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ'، اردو مجلس دہلی 1996، ص 127
4 A Dictionary of Psychology, ed. J. A. Atkins & others, IV edition, 1987

■

ماخذ: اردو ہندی فکشن میں اساطیر، **مصنف:** ناز قادری، **پہلی اشاعت:** 2021، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ

ابوبکر عباد

تقریباً مردوں کے دوش بدوش ہی خواتین نے بھی ناول نگاری کی ابتدا کی۔ بس یہی کوئی دس بارہ برسوں کے فاصلے سے، کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنا پہلا ناول مراۃ العروس 1869 میں لکھا اور رشیدالنسا نے 1881 میں۔ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی زوال اور جہالت و توہم پرستی کے عروج کا زمانہ تھا۔ مرداساس معاشرے میں ہر سطح پر ان کی برتری کا تسلط تھا، خواتین کی حیثیت ثانوی تھی اور ان کی تعلیم و تحفظ کی صورت حال مردوں سے کہیں زیادہ بدتر۔ لیکن اس اعتبار سے یہ عہد نیک شگون اور خیر کا حامل قرار پایا کہ اس میں ابھرنے والی بعض سیاسی تحریکوں اور جدید تعلیم کے اثر سے نظام زندگی اور طرز فکر میں مثبت تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں، ایک نئے دور کے آغاز کی بنیاد پڑی۔ سماجی اور ادبی زندگی کو نئی جہت بخشنے میں اس تاریخی تبدیلی کے آغاز و ارتقا میں سیاسی و سماجی تحریکوں اور قدیم و جدید تعلیم و نظریات کی آمیزش کے فروغ کے ساتھ ساتھ ایک اہم رول فکشن بالخصوص ناولوں کا بھی رہا ہے۔

اس حوالے سے اردو کے ابتدائی ناولوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے 'مراۃ العروس'، 'توبۃ النصوح'، 'ایامیٰ' اور علامہ راشدالخیری کے 'صبح زندگی'، 'شام زندگی' اور 'شب زندگی' وغیرہ کو نمایاں مثال کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ ان ناولوں کی بنیادی جہتوں میں سے ایک جہت عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تعظیم و توقیر کی طرف توجہ مبذول کرانا اور اصلاح معاشرہ کی کامیابی میں ان کے حقوق کی بحالی اور سرگرمی عمل کی شراکت کو یقینی بنانا تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد خواتین کے تعلیمی اور خانگی مسائل پر جن ادیبوں نے بطور خاص توجہ دی ان میں مردوں کے مقابلے خواتین کی تعداد کثیر، قابل ذکر اور لائق تعریف ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں یا کہیے ربع اول میں تعلیم یافتہ خواتین کی ایک ایسی جماعت سامنے آئی جس نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کی وجوہ کو دکھانے کی کوششیں کیں، ساتھ ہی ان کے حقوق کی بازیابی کے لیے ایک رجحان پیدا کرنے اور اسے ایک محاذ کی صورت قائم کرنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس رجحان سازی کے آغاز میں لاہور سے نکلنے والے 'تہذیب نسواں'، علی گڑھ سے شائع ہونے والے 'خاتون' اور دہلی سے جاری ہونے والے 'عصمت' جیسے اخبار و رسائل کی اشاعت و فروغ اور عورتوں کی بعض انجمنوں مثلاً 'مدرسۃ النسواں (1906) وغیرہ کے قیام کو بھی بنظر تحسین و توصیف دیکھنا چاہیے۔ تعلیم بالخصوص مغربی تعلیم کے زیر اثر خواتین کی روایتی سوچ و فکر میں جدت پیدا ہوئی، انھوں نے قدیم طرز زندگی کا رخ موڑنے کی کوششیں کیں اور جلسوں، سیاسی تحریکوں اور ادبی مشاغل میں حصہ لینا شروع کیا۔ خواتین کی ان تمام جدو جہد کے ذرائع میں سب سے اہم، زیادہ کنونسنگ، دیرپا اور اثر انگیز ذریعہ ناول نگاری قرار پایا، کہ دوسرے تحریکی اور علمی و ادبی وسائل کے مقابلے اس صنف میں دلچسپی، تجسس، ترغیب، تحرک، فکری تجزیہ، ذہنی ترفع اور روحانی آسودگی جیسے عناصر زیادہ اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ناول کے یہ وہ عناصر ہیں جو ذہنی تبدیلی، انفرادی و اجتماعی شخصیت کی تشکیل، سماج کی تعمیر اور معاشرے کی ترقی میں اپنے کردار مستحکم، متواتر اور موثر طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

اردو میں خواتین ناول نگاری کی تاریخ رشید النسا کے ناول 'اصلاح النساء' سے شروع ہوتی ہے۔ رشید النساء کے بعد محمدی بیگم کا نام آتا ہے اور پھر خواتین ناول نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس فہرست میں اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، عباسی بیگم، بیگم صغرا ہمایوں، ا-ض حسن بیگم، بیگم شاہنواز، ضیا بانو، طیبہ بیگم، حجاب امتیاز علی، والدہ افضل علی، صالحہ عابد حسین اور پھر رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہ سے لے کر آج اکیسویں صدی کے ربع اول تک خواتین ناول نگاروں کا سلسلۃ الذہب موضوعاتی تنوع، اسلوب سازی اور فکری ارتفاع کی روشن مثال کی صورت ناول کی دنیا کو ثروت مند بنا رہا ہے۔

رشید النسا عظیم آباد کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد شمس العلما سید وحید الدین چیف جسٹس تھے اور بھائی 'کاشف الحقائق' والے شمس العلما سید امداد امام اثر۔ سو، انھیں علمی و ادبی مجلسوں اور مذاکروں اور مشاعروں والا ماحول ملا۔ گھر کی الماریاں مختلف علوم و فنون اور متعدد زبانوں کی کتابوں سے آراستہ تھیں اور صحبتیں روشن خیالی اور جدید مباحث سے معمور۔ عورتوں کی تعلیم و اصلاح کا آغاز انھوں نے یوں کیا کہ پہلے تو

چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں یا کہیے ربع اول میں تعلیم یافتہ خواتین کی ایک ایسی جماعت سامنے آئی جس نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کی وجوہ کو دکھانے کی کوششیں کیں، ساتھ ہی ان کے حقوق کی بازیابی کے لیے ایک رجحان پیدا کرنے اور اسے ایک محاذ کی صورت قائم کرنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔

رشتہ دار لڑکیوں کو گھر میں پڑھانا شروع کیا اور پھر لڑکیوں کا باضابطہ ایک مکتب قائم کیا۔ لہٰذا رشید النسا کو بہار میں تعلیم نسواں کا پہلا علمبردار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

رشید النسا کو ناول لکھنے کا خیال خواتین کی اصلاح کرنے، انھیں غلط رسم و رواج سے نجات دلانے اور ان کی زندگی کو کامیاب اور بامقصد بنانے کے لیے آیا۔ حیرت نہ کیجیے کہ انھوں نے یہ ناول ایک فرضی نام سے چھے مہینے میں مکمل کرلیا تھا لیکن تیرہ برسوں تک ردی کی مانند پڑا رہا۔ جب ان کے لڑکے محمد سلیمان لندن سے بیرسٹر بن کر آئے تو انھوں نے والدہ سے ان کے ناول کے بارے میں پوچھا:

''...آپ جو کتاب لکھتی تھیں وہ کہاں ہے؟ میں نے کتاب نکال کر دے دی۔ برخوردار موصوف نے اول سے آخر تک اس کو پڑھ کر کہا کہ نہایت افسوس ہے ایسی عمدہ کتاب اتنی مدت تک وہیں ہی پڑی رہی۔.....اب اس کو ضرور طبع کرنا چاہیے.... برخوردار محمد سلیمان نے مطبع قیصری میں خود جا کر چھپنے کے لیے اس کتاب کو دے دیا۔'' (دیباچہ اول (1894)، اصلاح النساء، اشاعت 2000، ص 6، گلشن اقبال، کراچی)

واضح رہے کہ یہ ناول ابتدائی اشاعتوں میں بغیر دیباچے کے والدہ محمد سلیمان کے نام سے شائع ہوتا رہا تھا۔ 1994 کی اشاعت میں اس کا پہلا دیباچہ رشید النسا نے لکھا۔ بعد کی اشاعتوں میں دوسرا دیباچہ ثریا قرنی اور تیسرا سید قیصر امام نے تحریر کیا۔ مصنفہ نے ناول کا مقصد یوں بیان کیا ہے جس سے ناول کا موضوع و مافیہ پوری طرح سے نمایاں ہوجاتا ہے:

''اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں بڑی عاجزی سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ یا اللہ اس کتاب سے میری رشتہ مند لڑکیوں اور ہم وطن اور ملک کی عورتوں کو فائدہ پہنچا۔ اور ان کے توہمات اور ان کے بدخیالات کو رفع فرما اور ان کے برے عقائد کی اصلاح کر۔ آمین۔ چونکہ اس کتاب میں عورتوں ہی کی اصلاح مقصود ہے اس لیے اس کا نام 'اصلاح النساء' رکھا گیا۔'' (ایضاً)

رشید النسا کے بعد خاتون ناول نگاروں میں مسز مولوی سراج الدین کا نام گو کہ فراموش کردہ لیکن اہم ہے۔ ان کا ناول 'ناول دکن' کے عنوان سے رسالہ 'خاتون' کے 1905 کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا، بالکل پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کی طرح، جو ابتداً اودھ اخبار کی اشاعتوں میں 1878 سے 1879 تک شائع ہوتا رہا تھا۔ اس ناول کی تخلیقی فضا اور اس کے کرداروں میں مسز مولوی سراج الدین نے مشرق و مغرب کی تہذیب اور قدیم و جدید تعلیم کے عناصر و اثرات کے امتزاج کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ والد معروف سرجن اور نظام حیدرآباد کی فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ والدہ عربی فارسی کی عالمہ اور ادبی ذوق کی حامل تھیں۔ صغریٰ نے گھر پر ہی اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ سولہ سال کی کم عمری میں ان کی شادی مشہور بیرسٹر ہمایوں مرزا سے کی گئی۔ بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا نے ہندو مسلم اتحاد، پردہ سسٹم کی خرابیوں، گائے کے ذبیحے پر پابندی اور قومی یونیورسٹی کی ضرورت جیسے موضوعات پر متعدد مضامین، چھے سفرنامے اور چودہ ناول لکھے جن میں سے 'مشیر نسواں'، 'سرگزشت ہاجرہ' اور 'موہنی' کو بڑی شہرت ملی۔ انھوں نے حیا نام سے شاعری بھی کی۔ دو جلدوں میں ان کا سفرنامۂ یورپ خاصا اہم ہے۔ انھیں حیدرآباد کی پہلی خاتون ناول نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کا ناول 'مشیر نسواں یا زہرہ' کے نام سے 1906 میں شائع ہوا جس میں قدیم و جدید تہذیبی زندگی اور انگریزی طرز حیات کی عکاسی کے ساتھ روشن خیالی کے فروغ اور بے جا رسومات سے گریز کو کہانی کے مرکز میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے ناول 'موہنی' میں طلاق اور دوسری شادی جیسے معاملات کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ناول کی فضا خاصی پر اسرار، متصوفانہ قسم کی ہے۔

محمدی بیگم دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ مولوی سید ممتاز علی دیوبندی کی اہلیہ، مشہور ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کی والدہ، رسالہ 'تہذیب نسواں' کی ایڈیٹر اور حافظ قرآن تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر سے عربی فارسی پڑھی اور پھر انگریزی، ہندی اور حساب سیکھے۔ انھوں نے اپنے رسالے تہذیب نسواں میں جبری نفقہ، طلاق، تعدد ازدواج اور پردہ کی مخالفت میں بہت سے مضامین شائع کیے۔ یوں محمدی بیگم کو ہندوستان کی پہلی مسلم فیمنسٹ اور پہلی خاتون ایڈیٹر کہا جانا چاہیے۔ محمدی بیگم

نے مختلف موضوعات پر تقریباً درجن بھر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے تین کو ناول کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ 'شریف بٹی' (1908) چھپن صفحات پر مشتمل چھوٹا سا ناول ہے۔ اہم اور حیرت کی بات یہ ہے کہ خلاف رواج اس قصے یا ناول کا مرکزی کردار ایک غریب لڑکی ہے۔ ناول میں غریب لڑکیوں کی تعلیم اور سلیقہ شعاری کے حصول کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول 'صفیہ بیگم' میں بچپن کی منگنی کے عبرتناک انجام کو دکھایا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لڑکپن میں بچوں کے رشتے دراصل لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے زبردستی کی شادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ 'صفیہ بیگم' 1913 میں شائع ہونے والا نو ابواب پر مشتمل ننانوے صفحات کا مختصر سا ناول ہے، اس ناول میں بدچلن، جاہل اور ایسے لڑکوں سے شادی کے خلاف والدین کو اکسایا گیا ہے جسے لڑکی پسند نہ کرتی ہو۔ مرکزی کردار صفیہ کی آخری وصیت کے عنوان سے قائم کیے گئے باب کا یہ اقتباس دیکھیے:

''میری آخری التجا یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کے بیاہ شادی میں جان توڑ چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی کی جاتی ہے اسی طرح علم کی، صحت جسمانی کی، عادات کی، چال چلن کی، مزاج کی، کیفیت کی، اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضامندی کی کی جائے۔''

(صفیہ بیگم، دارالاشاعت پنجاب، 1913، ص 98)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ناول کا ہر باب کسی نہ کسی شعر سے شروع ہوتا ہے۔ بالکل مرزا محمد ہادی رسوا کے 'امراؤ جان ادا' کی طرح۔

والدہ افضال علی کا اصل نام اکبری بیگم تھا۔ لیکن مرد اساس معاشرے کے جبر اور تب کی مروجہ روایت کی مجبوری کے باعث انھوں نے اپنا پہلا ناول 'گلدستۂ محبت' عباس مرتضیٰ کے فرضی مردانہ نام سے شائع کروایا اور بعد میں والدہ افضال علی کے قلمی یا کنیتی نام سے لکھنے لگیں۔ انھوں نے چار ناول لکھے : 'گلدستۂ محبت'، 'شعلۂ پنہاں'، 'عفت نسواں' اور 'گوڈر کا لال'۔ ناول 'گوڈر کا لال' کے بارے میں قرۃ العین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ پہلی بار یہ 1907 میں شائع ہوا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''گوڈر کا لال چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس مسلم عورتوں کی بائبل کی حیثیت

> یوں محمدی بیگم کو ہندوستان کی پہلی مسلم فیمنسٹ اور پہلی خاتون ایڈیٹر کہا جانا چاہیے۔ محمدی بیگم نے مختلف موضوعات پر تقریباً درجن بھر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے تین کو ناول کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

اختیار کرلی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ اس کے قارئین کو نہ یہ معلوم تھا کہ 'والدہ افضال علی' کون ہیں اور نہ یہ کہ انھوں نے اس ناول کا پس منظر اور کردار کہاں سے حاصل کیے ہیں۔''

(کارِ جہاں دراز ہے، ممبئی، 1977، ص 156)

ستائیس ابواب اور سات سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل یہ ایک ضخیم ناول ہے۔ پہلے یہ تین الگ الگ حصوں اول، دوم اور سوم کے طور پر شائع ہوا، بعد ازاں تینوں حصے ایک ساتھ شائع ہوئے۔ اس ناول کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اکبری بیگم نے معاشرے میں رائج برائیوں اور گھریلو مسائل کو موضوع بنانے کے علاوہ اس ناول کے ذریعے پردے کی مخالفت کی ہے اور غالباً پہلی بار مسلم لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم کی وکالت کی ہے۔

نذر سجاد حیدر اردو کے پہلے افسانہ نگار (بعض قول کے مطابق) سید سجاد حیدر یلدرم کی اہلیہ اور مشہور فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی والدہ تھیں۔ انھوں نے متعدد مضامین اور مختصر کہانیوں کے علاوہ کئی ایک ناول بھی لکھے ہیں۔ یہ آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں جیسی تحریکوں کی اہم رکن بھی رہی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کے پہلے ناول 'اختر النساء بیگم' کو مولوی ممتاز علی نے 'نول کشور پریس لاہور' سے 1911 میں شائع کروایا تھا۔ اس ناول میں جہالت، غلط رسم و رواج اور توہم پرستی کی مخالفت کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ماقبل ناولوں کے مقابلے اس ناول کی ہیروئن خاصی ترقی پسند اور روشن خیال ہے چنانچہ وہ جگہ جگہ جرأت مندانہ قدم اٹھاتی رہتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ اس پر سرسید تحریک کا اثر کافی حد تک نمایاں ہے۔ اختر النساء بیگم کے علاوہ ان کے چھے ناول: حرماں نصیب، آہ مظلوماں، جاں باز، ثریا، نجمہ' اور 'مذہب اور عشق' خاصے مقبول رہے ہیں۔ ان تمام کو قرۃ العین حیدر نے 'ہوائے چمن میں خیمۂ گل' کے نام سے مرتب کرکے اڑتالیس صفحات کے بے حد معلوماتی دیباچے کے ساتھ یکجا شائع کردیا ہے۔

فخر النسا بیگم کا نام ان کے ناول 'افسانۂ نادر جہان' پر اس طرح لکھا ہوا ہے۔ طاہرہ بیگم الملقب بہ نواب فخر النسا نادر جہاں بیگم۔ دو سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل مذکورہ ناول منشی نول کشور لکھنؤ سے 1917 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی تب کے ادبی رواج کے مطابق غلط رسم و رواج کی مذمت، تعلیم نسواں کی اہمیت، لڑکیوں کی سلیقہ شعاری اور امور خانہ داری کی بحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی مرد و عورت کے حقوق اور مساوات کے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک مسلسل ناول ہے جس میں کہیں بھی کوئی فصل یا باب قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بیانیے کو کسی حد تک مسجع اور مقفی بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم ناول روزمرہ، محاورے اور عمدہ زبان کی آمیزش سے دلچسپ ہوگیا ہے۔

طیبہ بیگم نواب عماد الملک بہادر کی صاحبزادی تھیں، بلگرام میں پیدا ہوئیں، گھر پر ہی ایک مولوی صاحب سے اردو فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، بعد

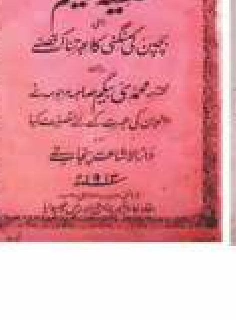

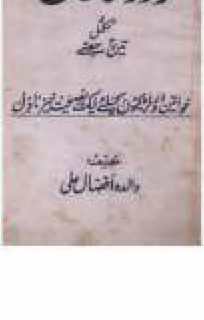

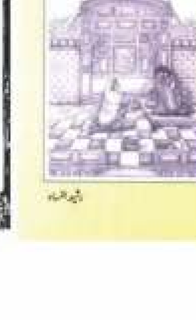

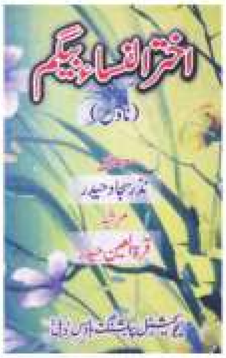

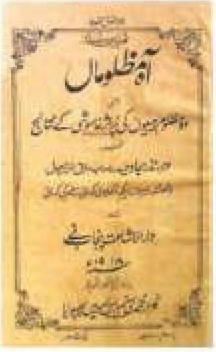

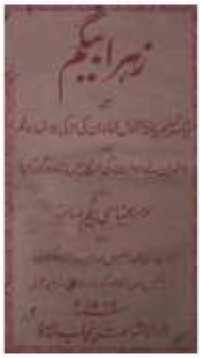

ازاں حیدرآباد کے اسکول میں مشہور سیاست داں مسز سروجنی نائیڈو کے ساتھ انگریزی وغیرہ کی تعلیم پائی اور پھر 1894 میں مدراس یونیورسٹی سے بیچلر کی ڈگری حاصل کر کے پہلی مسلم خاتون گریجویٹ بنیں۔ ڈاکٹر مرزا کریم خان خدیو جنگ بہادر سے شادی کرنے کے بعد آگے کی تعلیم موقوف کر دی۔ عورتوں کی تعلیم اور اصلاح معاشرہ کے جذبے کے تحت انھوں نے حیدرآباد میں آٹھ اسکول بنوائے اور 'لیڈیز ایسوسی ایشن' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ انھوں نے 'انجمن خواتین اسلام' کا چارج بھی سنبھالا جسے بیگم رقیہ سخاوت حسین نے عورتوں کی تعلیم، آزادی اور ہنر کے حصول کے لیے قائم کیا تھا۔ طیبہ بیگم خدیو جنگ نے ہندوستانی لوک کہانیوں اور لوک گیتوں پر بھی کام کیا ہے۔ انھوں نے دو ناول تحریر کیے ہیں: 'حشمت النسا' اور 'انوری بیگم'۔ انوری بیگم کو انھوں نے 1905 میں مکمل کیا تھا اور 1909 میں شائع کیا، تاہم اس کی سرکاری اشاعت ان کے انتقال کے بعد 1922 میں ہوئی۔ ان ناولوں میں بھی تعلیم نسواں اور معاشرتی صورت حال کو مرکزی محور بنایا گیا ہے۔ دونوں ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں حیدرآباد کا رہن سہن، وہاں کی تہذیب و ثقافت، بود و باش اور حیدرآباد کی خواتین کی زندگیاں آئینے کی مانند شفاف نظر آتی ہیں۔

عباسی بیگم مشہور فکشن نگار حجاب امتیاز علی کی والدہ تھیں۔ وہ اپنے عہد کی اہم خاتون مدیر، نظم نگار، مکتوب نگار اور ناول نگار تھیں۔ ان کا ناول 'زہرا بیگم' 1929 میں شائع ہوا۔ اس میں ایک تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی کا فسانۂ درد والم بیان کیا گیا ہے جسے اس کے والدین نے دولت کی لالچ میں شادی کر کے اسے زندہ درگور کر دیا۔ عباسی بیگم نے اپنی تحریروں میں سماج بالخصوص مسلم معاشرے کی خرابیوں کو بیان کر کے انھیں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

حجاب امتیاز علی حیدرآباد کے ایک معزز خاندان کے فرد سید محمد اسماعیل کی صاحب زادی تھیں لیکن ان کی پیدائش 1908 میں مدراس میں ہوئی۔ یہ ہندوستان کی پہلی اور دنیا کی دوسری مسلم خاتون پائلٹ تھیں۔ ان سے دو سال قبل یعنی 1934 میں آذربائیجان کی مسلم خاتون زلیخا سید ماد ووا نے اپنا پائلٹ کا لائسنس حاصل کیا تھا۔ حجاب کو کم عمری سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کی پہلی کہانی نو برس کی عمر میں شائع ہوئی اور

> صالحہ عابد حسین نے سیرت وسوانح، ڈرامے، خطوط، مضامین، تراجم، آپ بیتی، بچوں کے ادب اور افسانوں کے ساتھ ساتھ آٹھ عدد ناول بھی لکھے ہیں۔

انھوں نے اپنا پہلا اور اردو کا اہم رومانی ناول 'میری ناتمام محبت' بارہ سال کی عمر میں لکھ لیا تھا۔ پہلے یہ حجاب اسماعیل کے نام سے لکھتی تھیں۔ 1930 میں ان کی شادی اردو کے مشہور ڈراما نگار اور اسکرپٹ رائٹر امتیاز علی تاج سے ہوئی تو حجاب امتیاز علی نام سے لکھنے لگیں۔

حجاب امتیاز علی کا تحریری عرصہ ساٹھ برسوں کو محیط ہے۔ انھوں نے سگمنڈ فرائڈ کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کے اثرات ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں، خاص طور سے ان کے ناول 'اندھیرا خواب' اور 'پاگل خانہ' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے یادگار ناولوں میں 'ظالم محبت'، 'وہ بہاریں یہ خزائیں'، 'موم بتی کے سامنے' اور 'سیاح عورت' شامل ہیں۔ حجاب امتیاز علی اپنے رومانی فکشن کے حوالے سے مستحکم اور مستند شناخت رکھتی ہیں۔ ان کی شہرت ڈائری نگار، مکتوب نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے بھی ہے۔ ان کے ناول وافسانے کی دنیا ایسی سحر انگیز ہوتی ہے کہ قاری اس میں کھو سا جاتا ہے۔ بالعموم ان کی کہانیاں عورت، رومان، فطرت اور نفسیات کے تانے بانے سے تیار ہوتی ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو ناول کو چند خوبصورت اور یادگار کردار دیے ہیں جیسے: ڈاکٹر گار، سر بارلی، دادی زبیدہ، روحی، جسوتی اور حبشاں زوناش وغیرہ۔

صالحہ عابد حسین کا تعلق ایک بڑے علمی وادبی گھرانے سے تھا۔ یہ خواجہ الطاف حسین حالی کی پڑپوتی، ممتاز عالم خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی، خواجہ غلام السیدین کی بہن اور معروف دانشور سید عابد حسین کی اہلیہ تھیں۔ صالحہ عابد حسین نے سیرت و سوانح، ڈرامے، خطوط، مضامین، تراجم، آپ بیتی، بچوں کے ادب اور افسانوں کے ساتھ ساتھ آٹھ عدد ناول بھی لکھے ہیں: عذرا، آتش خاموش، راہ عمل، قطرہ سے گہر ہونے تک، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، الجھی ڈور، گوری سوئے سیج پر اور ساتوں آنگن۔ ان کے ناولوں میں مشرقی عورتوں کے مسائل، ان کی طرز فکر اور ان کے جذبات واحساسات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور گھریلو رشتوں کی رنگا رنگی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کی مانند ان کی تحریروں میں بھی علی گڑھ جگہ جگہ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان سب کے علاوہ ابتدائی خواتین ناول نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ب۔ سدید (بیاض سحر)، ا۔ ض حسن (روشنک بیگم)، ضیا بانو (فغان اشرف، فریب زندگی، انجام زندگی)، حمیدہ سلطان مخفی (ثروت آرا بیگم)، بیگم شاہنواز (حسن آرا بیگم)، ظفر جہاں بیگم (اختری بیگم)، خاتون اکرم (پیکر وفا)، فاطمہ بیگم منشی فاضل (صبر کا پھل) اور خاتون (شوکت بیگم) وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان سبھوں نے اپنے اپنے وقت میں تعلیمی، اصلاحی، افادی اور مقصدی ناول لکھ کر اردو ناول نگاری کی بھرپور خدمت کی، ایک نئے سماج اور بہتر معاشرے کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا اور فکشن کے فن اور زبان و اسلوب کی توسیع میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

■

Abu Bakar Abbad
Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007
bakarabbad@yahoo.co.in

پنچ تنتر کے اردو تراجم

سید اسرار الحق سبیلی

عالمی

ادب میں کچھ کتابیں ایسی لافانی اور شاہ کار ہوتی ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ ایسی کتابیں اخذ و ترجمے کے توسط سے پوری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔ جیسے فارسی میں سعدی کی گلستاں و بوستاں، فردوسی کا شاہ نامہ، مولانا روم کی مثنوی معنوی، عربی میں الف لیلہ ولیلہ اور سنسکرت میں پنچ تنتر وغیرہ۔ یہ کتابیں گویا بین الاقوامی سطح پر ادبی و علمی ورثے کا درجہ رکھتی ہیں، اور قوموں کے درمیان علمی و فکری ہم آہنگی کا ذریعہ ہیں۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی کے بقول ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں ادبِ اطفال کی بنیاد پنڈت وشنو شرما کی 'پنچ تنتر' سے پڑی۔ وشنو شرما نے اسے جانوروں کی زبانی کہانیوں کی شکل میں پیش کیا۔ پنچ تنتر کی تصنیف کا مقصد دلچسپ کہانیوں کے ذریعے اخلاق و حکمت کی تعلیم دینا تھا۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے کے حوالے سے اس کی وجہِ تصنیف یوں بیان کی ہے:

''جنوبی ہندوستان کے روپا نگر میں امر کیرتی راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ چاروں ہی بے وقوف اور جاہل تھے۔

انھیں پڑھانے کے لیے کئی طریقے آزمائے گئے، مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔ آخر کار یہ ذمے داری پنڈت وشنو شرما کو سونپی گئی کہ وہ ان راج کماروں کو راج کاج کے طریقے سکھائیں اور انھیں اخلاقیات کی تعلیم دیں۔ وشنو شرما نے جانوروں کی وساطت سے انسانی خصوصیات، سماجی رشتوں اور انسانی پیچیدگیوں کی تشریح و توضیح کی۔ یہ کہانیاں اتنی دلچسپ ہیں کہ آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔''1

''کلیلہ و دمنہ' کے مقدمہ میں مذکور ہے کہ اس کتاب کو ہندوستان کے فلسفی اور معلم بیدبا نے وقت کے بادشاہ دبشلیم کے لیے لکھا تھا۔ جب کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ 'پنچ تنتر' کسی ایک شخص کی تخلیقی کاوش نہیں ہے، بلکہ اس کی جڑیں نامعلوم زمانوں تک قدیم ہندوستان کے اجتماعی لاشعور میں ہیں، اور 'پنچ تنتر' ہندوستان کے تین مقبول اور قدیم ادبی فن پاروں: پنچ تنتر، ہتو اپدیش اور سرت ساگر کا منتخب مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر مرضیہ عارف کے بقول ڈاکٹر ہرٹل کا دعویٰ ہے کہ 'پنچ تنتر' آج اپنے حقیقی روپ میں موجود نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر 'تانترا ایکا' نام کی ایک قدیم کتاب کی بعض کہانیوں، داستانوں اور روایتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی اصل کتاب دو سو قبل مسیح کشمیر میں تالیف کی گئی تھی، جس کا ایک قلمی نسخہ دکن لائبریری پونا میں محفوظ ہے۔ بیش تر ریسرچ اسکالر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصل کتاب ایک طرح کے سیاسی اور سماجی نصاب کی شکل میں نوعمر شاہ زادوں کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن اس کے ضائع ہو جانے کے بعد یادداشتوں کی بنیاد پر از سرِ نو پنچ تنتر مرتب کی گئی۔ اس میں بعض کہانیاں پرانی کتاب کی اور کچھ نئی شامل کی گئی ہیں، جو ظاہر ہے کہ اپنی اصل سے مختلف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ''پنچ تنتر'' کو مرتب کرنے والے ودیا پتی کا زمانہ تین سو سال قبل مسیح ہے۔ دوسری روایت کے مطابق وشنو کرمان کے سر اس کتاب کو لکھنے کا سہرا بندھتا ہے۔

اب رہی بات کہ یہ کس زبان میں لکھی گئی؟ بعض لوگوں نے اسے کشمیری زبان میں بتایا ہے، اور اس کا ایک نسخہ دکن لائبریری پونے میں محفوظ بتایا ہے۔ بعض نے پراکرت بھی بتایا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کا ہند کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا ہو۔ اسی طرح بیدبا و ودیا پتی کا ترجمہ ہو، اور یہ نام کے بجائے صفت ہو، اور اصل نام وشنو شرما یا وشنو کرمان ہو۔

'پنچ تنتر' ادبِ عالیہ کا وہ شاہ کار ہے، جس کا ترجمہ فارسی، عربی، ترکی اور عبرانی سمیت دنیا کی تقریباً پچاس بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ خسرو اول نوشیرواں عادل کے عہد حکومت (531-578ء) میں سنسکرت زبان میں لکھی گئی پنچ تنتر کا سب سے پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ماہر حکیم برزویہ نے کیا۔ برزویہ نے اصل کتاب پر مزید کہانیوں اور واقعات کا اضافہ کیا، اور کتاب پر ایک مقدمہ لکھا، جس میں اس نے اپنے احوال اور حصولِ کتاب کے لیے ملکِ ہند کو روانگی، ہند میں قیام اور واپسی کے احوال لکھے ہیں۔ اس پہلوی ترجمے کو عباسیوں کے عہد حکومت میں فارسی نژاد نامور ادیب و انشا پرداز عبداللہ ابنِ مقفع (106-143ء) نے 'کلیلہ و دمنہ' کے نام سے عربی میں منتقل کیا، اور اس میں مزید چار فصلوں کا اضافہ کیا۔ بقول فلپ کے۔ ہتی 'کلیلہ و دمنہ' ہم تک پہنچنے والی قدیم ترین ادبی عربی تخلیق ہے۔ اصل سنسکرت اور اس کا پہلوی ترجمہ ناپید ہو جانے کے باعث تمام تراجم کی بنیاد اسی عربی ترجمے پر ہے۔

ابن مقفع کے عربی نسخے سے کئی تراجم دوبارہ فارسی میں ہوئے، جن کو سامنے رکھ کر حسین واعظ کاشفی نے 'انوار سہیلی' مدون کی۔ جلال الدین اکبر کی ایما پر ابو الفضل نے کلیلہ و دمنہ کے دستیاب نسخوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھیں سادہ اور عام فہم زبان میں نئی ترتیب کے ساتھ فارسی کا جامہ پہنایا اور اس کا نام ''عیارِ دانش'' رکھا۔

اردو میں عیارِ دانش کے کئی ترجمے ہوئے، لیکن زیادہ شہرت شیخ حفیظ الدین احمد کے ترجمے 'خردِ فردا' کو ملی، جو 1805 میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے چھپی۔ اسی طرح دکن میں کلیلہ و دمنہ کے کئی تراجم ہوئے۔ دکنی زبان کے کئی ادبا، شعرا اور صوفیا نے پنچ تنتر کے مختلف اقتباسات اور کہانیوں کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے تحت محمد ابراہیم بیجاپوری نے 1823 میں فارسی 'انوار سہیلی' کا ترجمہ دکنی زبان میں کیا۔2

دکنی زبان میں پنچ تنتر نے نہ صرف ادب کو کافی فروغ دیا، بلکہ دکنی بیانیہ ادب پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔ اس نے کہانی سنانے کی مقامی روایت کو تقویت دی، اور اخلاقی سبق کے ذریعے لوگوں کی تربیت کی۔

'پنچ تنتر' کے اردو مترجمین میں سید حیدر بخش حیدری، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مولوی ظہیر الدین، مولوی فیروز الدین اور محمد عبد الغفور نساخ کا نام بھی آتا ہے۔

شکنتلا دیوی کی مرتبہ 'پنچ تنتر' کا ایک اردو ترجمہ ڈاکٹر اطہر پرویز نے کیا تھا، جو 1963 میں اردو گھر علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ اس کی زبان بچوں کے لیے بہت آسان اور عام فہم ہے، اور ترجمہ کے بجائے اصل

کہانی کا گمان ہوتا ہے۔

عربی 'کلیلہ ودمنہ' کا براہِ راست اردو ترجمہ حیدرآباد کے ایک عالم وفاضل مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی نے 2011 میں مکمل کیا۔ 2014 میں یہ ترجمہ دوسوتیس صفحات پر مشتمل قبا گرافکس حیدرآباد نے شائع کیا ہے، جو ہندوستان کے مختلف شہروں کے کتب خانوں میں دستیاب ہے۔

اس ترجمے کا پیش لفظ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حفظہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کلیلہ و دمنہ زبان و ادب کو سیکھنے سکھانے اور حاکم ومحکوم کو اپنے اپنے دائرے میں دور اندیشی کی تعلیم دینے میں ایک نمایاں اور کامیاب کتاب ہے۔ انہوں نے مترجم کی ان الفاظ میں ستائش کی ہے:

''ابنِ مقفع کے ادبی شہ پاروں کو اردو کا قالب دینے میں مترجم نے بڑی کوشش کی ہے۔ ترجمہ میں امکانی حد تک سلاست و روانی پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ دوسری زبان میں ادب کا وہی معیار باقی رکھنا جو اس کتاب میں ہے جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے، بڑی دقت اور مزاولت کا طالب ہے، تاہم مترجم قابلِ ستائش ہیں کہ انھوں ادب کے اس مرغزار کی سیر کی اور اپنے اردو داں بھائیوں کے لیے اپنی مادری زبان میں اس کی عکاسی کی۔ 3

جب یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ پنچ تنتر کا اصل نسخہ ناپید ہے، اور اس کا پہلا فارسی ترجمہ ماہر طبیب برزویہ نے کیا جو فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ اسی طرح فارسی ترجمہ سے ابنِ مقفع نے عربی میں ترجمہ کیا ہے، جو فارسی کا ماہر انشاپرداز، اس کے اصول وآداب کا واقف کار اور اس پر مکمل قدرت رکھتا تھا۔ اس کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسی طرح وہ پہلوی اور یونانی زبان سے بھی واقف تھا۔ وہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصف حصے میں بصرہ میں پلا بڑھا۔ وہ عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھا، اور عربی کا نامور ادیب شمار کیا جاتا ہے۔

آج جب عربی نسخہ ہی ہمارے سامنے اصلی صورت میں موجود ہے، اور اس کا مکمل اردو ترجمہ بھی موجود ہے تو ہمیں اسی کو بنیاد بنا کر بات کرنی چاہیے، جیسا کہ فارسی مترجم برزویہ نے اپنے مقدمہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ہندوستانی فلسفی بیدبا نے ہندوستانی بادشاہ دبشلیم کے لیے یہ کتاب لکھی تھی، جو سکندر رومی کے جانشین کے بعد ملکِ ہند کا بادشاہ بنا تھا، اور اقتدار میں آنے کے بعد نہایت سرکش اور ظلم وستم کا خوگر بن گیا تھا۔ بیدبا نے اس کی اصلاح اور اس کو راہِ راست پر لانے کے لیے یہ کتاب ترتیب دی، بلکہ کتاب لکھنے سے پہلے بادشاہ سے ملاقات کر کے اور اپنے علم وحکمت اور اخلاق و آداب سے اس کو متاثر کیا، جس کی بنا پر بادشاہ نے اس کو اپنا وزیر مقرر کر لیا، اور بیدبا سے یہ کتاب لکھنے کی خواہش کی۔ برزویہ کے مقدمہ میں مذکور ہے کہ دبشلیم بیدبا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے ایسی فصیح و بلیغ کتاب لکھ ڈالو، جس میں تم اپنے قوائے فکر کو استعمال کرو، جو ظاہراً سیاستِ عامہ اور اس کی اصلاح پر مشتمل ہو، باطنی طور پر اس میں بادشاہوں کے اخلاق، ان کے رعایا پر حکم رانی کے انداز، رعایا کی بادشاہ کی تابع داری اور اس کی خدمت گزاری جس سے خود میں اور دیگر لوگ بہت سی ان ہلاکت خیزیوں اور تباہیوں سے بچ جائیں، جس کی ضرورت بادشاہ کے مصائب میں پڑ جانے کے وقت ہوتی ہے۔ یہ کتاب میرے بعد سالہا سال یادگار رہے...بیدبا! تم نہایت صائب الرائے اور بادشاہوں کے معاملات میں اطاعت گزار واقع ہوئے ہو۔ میں نے یہ چیز تمہارے اندر پرکھ لی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم ہی اس کتاب کو ترتیب دو، اس میں تم اپنے قوائے فکر وعمل کو بروئے کار لاؤ۔ اپنے تئیں پوری ان تھک کوشش کرو۔ اس سلسلہ کی پوری جدوجہد کرو۔ یہ کتاب حقائق، طنز ومزاح، لہوولعب اور حکمت وفلسفہ پر مشتمل ہونی چاہیے۔''4

بیدبا نے یہ کتاب اپنے شاگرد کے تعاون سے ایک سال میں مکمل کی۔ بیدبا اپنے شاگرد کو کتاب املاء کراتا تھا۔ بیدبا اپنے شاگرد کو کتاب کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کہتا ہے:

''بادشاہ کی شرط کے مطابق اسے تفریحِ طبع اور علم و حکمت دونوں کا مجموعہ بنادے... وہ اور اس کا شاگرد بادشاہ کے اس مطالبہ پر غور وفکر کرنے لگے۔ ان کی عقل نے انھیں یہ رہ نمائی کی کہ ان کا کلام دو جانوروں کی زبان میں ہو۔ جانوروں کی گفتگو وہ کھیل کود، تفریحِ طبع اور مزاح و مذاق کی جگہ رکھیں۔ خود ان دونوں کی گفتگو حکمت ہو۔ حکیم اور دانش ور اس کتاب میں حکمت پر توجہ دیں، جانوروں اور مزاح و مذاق کو چھوڑ دیں، اور یہ سمجھ لیں کہ اس کتاب کا مقصود بھی یہی ہے، اور عوام اس کتاب کی جانب دو جانوروں (لومڑی: کلیلہ اور دمنہ) کی باہم گفتگو سے متعجب ہو کر متوجہ ہوں۔''5

ان اقتباسات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ بیدبا نے یہ کتاب صرف شہ زادوں اور راج کماروں کے لیے نہیں لکھی تھی، بلکہ تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ بادشاہ اور رعایا کے درمیان خوش گوار تعلقات، اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ رکھنے، علم وحکمت اور فلسفہ ودانش کی باتوں سے اپنے ذہن ودماغ کو روشن ومنور کرنے کے لیے لکھی تھی۔ اس کی ضرورت نہ صرف شہ زادگان کو، بلکہ حکمرانِ وقت اور عوام وخواص کو بھی ہے۔ مذکورہ اقتباسات اور مقدمہ کتاب کی روشنی میں ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے اور ڈاکٹر خوشحال زیدی کی باتوں کی تصدیق نہیں کی جاسکتی ہے کہ پنچ تنتر راج کماروں کو راج کاج کے طریقے سکھانے اور انھیں اخلاقیات کی تعلیم دینے کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ نفسیاتی طور پر بڑوں کے مقابلے میں بچے جانوروں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کی یہ دلچسپی دائمی ہے، اور آج تک برقرار ہے۔ آج بھی بچے جانوروں اور پرندوں پر مشتمل کہانیاں، کومکس، کارٹون اور سیریلس بڑی دلچسپی سے پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ بچوں کی اسی دلچسپی اور شوق وذوق کے پیشِ نظر ہر دور میں پنچ تنتر کی کہانیاں بچوں کے نصاب میں شامل کی جاتی رہی ہیں۔

غرض 'پنچ تنتر' سنسکرت ادب کی ایسی شاہ کار اور مقبولِ عالم تصنیف ثابت ہوئی کہ اخذ وترجمہ کے ذریعے جس کے فیض کا سلسلہ صدیوں سے جاری و ساری ہے، اور اس کے علوم و معارف، فکر وفلسفہ اور حکمت و موعظت سے روشنی حاصل کرنے والوں کا دائرہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد وسیع سے وسیع تر ہے۔

حواشی

1. ڈاکٹر خوشحال زیدی: اردو میں بچوں کا ادب۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1989، ص: 155-154، بحوالہ: ہری کرشن دیوسرے۔ بچوں کا عالمی ادب۔ ماہ نامہ آج کل نئی دہلی، جنوری 1979
2. ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: دکھنی نثر پارے۔ بحوالہ: ادب اطفال کے چند گوشے، از: ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2021، ص: 78
3. مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔ کلیلہ و دمنہ (اردو) پیش لفظ۔ قبا گرافکس حیدرآباد، 2014، ص: 7
4. مفتی محمد رفیع الدین حنیف قاسمی۔ کلیلہ ودمنہ (اردو)۔ قبا گرافکس حیدرآباد، 2014، ص: 48-47
5. حوالہ سابق، ص: 49

■

Dr. Syed Asrarul Haque Sabeeli
Asst. Professor & Head, Dept. of Urdu,
Govt. City College (A) Nayapul
HighCourt Road,
Hyderabad-500002 (Telangana)
syedasrarulhaque@gmail.com

اردو ادب میں تنقیدی نظریات ورجحانات

محمد خواجہ مخدوم محی الدین

تنقید کا وجود عالم انسانی کے وجود کے ساتھ ہوا۔ تنقید کے عام معنی اچھے اور برے کی تمیز کرنے کے ہیں۔ انسان تنقید کا شعور لے کر پیدا ہوا۔ یونانیوں نے سب سے پہلے ادب اور تنقید پر روشنی ڈالی اور اس کو معراج کمال تک پہنچایا۔ تنقید کسی ادبی تخلیق میں فن پارے کی خوبیوں کو ظاہر کرنے کا ایک نظریہ ہے۔ تنقید کا اہم کام ادب کی عظمت کا صحیح اندازہ لگانا ہے۔ تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے جس میں کسی بھی ادبی تخلیق سے حجابات کے پردے اٹھا کر اس کے اقدار کو متعین کرنا ہے۔ نقاد اچھائی اور برائی میں تمیز کر کے ایک نئی چیز کو جنم دیتا ہے، اس لیے اس عمل کو بھی تخلیق قرار دیا گیا ہے۔ تنقید اس تخلیقی قوت کو کہتے ہیں جو ادیب کے پیش کردہ کارناموں کو علاحدہ حیثیت سے دوبارہ پیدا کرنے اور ذہن پر وہی نقش ثبت کرنے کا کام کرتی ہے۔ اردو ادب میں رومانی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، مارکسی تنقید اور سائنٹفک تنقید وجود میں آئی۔

دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ تخلیق ذہن انسانی ہے جس میں سارا خیر وشر سمیٹ کر آ گیا ہے۔ ادب وفنون بھی ایک چھوٹے سے ذہن کا کرشمہ ہے۔ خواہ وہ مصوری ہو یا بت تراشی فن تعمیر ہو یا موسیقی اور شاعری لیکن شعر وادب کو ان تمام فنون پر اس لیے فوقیت ہے کہ اس میں زندگی کا احاطہ کرنے کی سکت زیادہ ہے۔ ادب فنون لطیفہ تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ ادب ہماری تہذیبی زندگی کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ادب کی تعریف کے سلسلے میں ناقدین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ناقدین نے ادب کو صرف جمالیاتی انبساط ہی تک محدود رکھا۔ اسے صرف مسرت کا ذریعہ بنایا۔ ادب پر سب سے پہلے باقاعدہ اظہار مشہور فلسفی افلاطون نے کیا۔ اس نے اپنے زمانے کی تمام ضروریات سے بغاوت کی، اور حقیقت اور حسن کی تلاش میں ایک نئے فطری نظام کو جنم دیا۔ افلاطون کی نگاہ میں خیر اور سچائی ہی اصل حقیقت ہے۔ وہ ادب وشاعری میں بھی حقیقی مقصد کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

افلاطون کا اہم شاگرد ارسطو نے اپنی کتاب 'بوطیقا' میں ادب وشاعری پر تفصیل سے بحث کی اور افلاطون کے نقطۂ نظر پر بحث کی۔

اس طرح ادب میں دو نظریے پیدا ہو گئے 'ادب برائے ادب'، 'ادب برائے زندگی'۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے کہا ہے:

''ادب ایک فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے''۔ اس کا مقصد اظہار، ترجمانی وتنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔ اس کا معاون اظہار خیال اور قوت متخیرہ ہے اور اس کے خارجی روپ وحسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی چیز اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے ورنہ شدت تاثر اور تخیل کی مصوری اور تخلیق واختراع کا عمل دوسرے فنون میں بھی ہے۔''

(بحوالہ: 'مباحث' از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ص 22)

ادب دراصل زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات اور احساسات کے علاوہ مشاہدات و تجربات بھی نظر آتے ہیں۔ 'ادب برائے زندگی' کا تصور کارل مارکس کے نظریے سے پیدا ہوا۔

ادب زندگی کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ادب کو زندگی کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ ادب زندگی کا ترجمان اور نقال ہوتا ہے۔

ادب زندگی اور اس کے تجربات کو سمجھنے کا شعور رکھتا ہے۔ بہترین ادب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اجتماعی خواہشات کی تکمیل کرے۔ ٹین نے کہا ہے کہ:

''ادب نسل، ماحول، وقت سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ ادب کی اس تصریح پر غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب سماج، ماحول، زندگی، تہذیب اور معاشرت کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے اور اگر کسی تخلیق میں یہ صفات نہیں رہیں تو اس کو بہترین ادب میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔''

(بحوالہ: Litrature for a age of Science
Hymen and Kelen Spalding-P-10)

ادب کو زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ہی پرکھا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس کا زندگی سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہوتا ہے۔ اس زمانے کا ادب زوال پذیر ہوتا ہے، جب وہ زندگی کی حقیقتوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اردو ادب میں نئے رجحانات کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری حصے اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں جس کی وجہ سے ہندوستان ایک نئی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اور وہ تھی اس کی تہذیب اور روایات کی کشمکش۔ نئی زبان، نئی تہذیب اور نئی باتوں کو قبول یا رد کرنے کا مسئلہ۔ اس کے ساتھ ہی متوسط طبقے کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی جس کے لیے سرسید، حالی، مولانا محمد حسین آزاد، شبلی اور ذکاء اللہ وغیرہ نے نئی باتوں کو اپنانے کی تحریک شروع کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے نئے علوم اور نئی تہذیب کی حمایت کی اور تعلیم کی اہمیت پر زور دے کر بیداری پھیلانے کی کوشش کی۔

ادب میں ہمیشہ مختلف نظریات سرگرم رہے۔

ادب ہمیشہ نظریات کا پابند رہا۔ افلاطون سے لے کر ہیگل تک فرائیڈ اور مارکس تک ادب کسی نہ کسی صورت میں نظریات کا پابند رہا ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے جب کائنات اور فنون لطیفہ کو نقل کیا تو دوسرے لوگوں نے صرف شخصیات کا آئینہ، تنقید حیات یا زندگی کا ترجمان کہا تو اپنی نظریات کے تحت ادب کو پیش کرتے رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب کو کسی نظریہ یا فلسفہ کا غلام بنادیا جائے۔ ایسی صورت میں اس کا حسن محدود ہوجائے گا۔ اس کی تخلیق کے لیے ایک آزاد اور کھلی فضا کی ضرورت ہے جہاں اس کے تخیل کی پرواز نہ روکی جائے۔ ادب کو کسی فلسفہ کا غلام بنادینے میں اس کی ادبیت اور افادیت دونوں مجروح ہوتے ہیں۔

یونان میں علم وحکمت بام عروج پر تھی۔ تنقید اور اس کا معیار بھی سب سے پہلے یونانی ادب میں ملتا ہے اور تنقید کا پہلا اشارہ یونان کے قدیم ترین شاعر 'ہومر' کے ہاں ملتا ہے۔

ادب کو زندگی کے مسائل سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی اس کے مطالبات اور اس کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے بہترین ادب کی تخلیق ممکن نہیں چونکہ ہر ادیب یا فنکار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر بنائے۔ علما نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے اسے تفسیر حیات کا نام دیا ہے اور تفسیر بغیر تنقیدی شعور کے ممکن نہیں۔ اس لیے تخلیق کے ساتھ ہی تنقید کا عمل بھی شروع ہوجاتا ہے۔ تنقیدی شعور کے بغیر نہ تو اعلیٰ ادب تخلیق ہوسکتا ہے اور نہ فنی تخلیق کی قدروں کا تعین ممکن ہے اس لیے اعلیٰ ادب کی تخلیق اور ادب کی پرکھ کے لیے تنقید لازمی ہے۔ تنقید کا وجود عالم انسانی کے وجود کے ساتھ ہوا۔ تنقید کے عام معنی اچھے اور برے میں تمیز کرنے کے ہیں۔ جب زمین پر انسان کا وجود ہوا تو اس نے بعض درختوں، پودوں، موسموں، ہواؤں اور پھولوں پھلوں کے سلسلے میں اپنی پسند اور ناپسندی کا اظہار کیا، اور کڑوے اور تلخ پھلوں سے اس کا منہ بدمزہ ہوا، اور اس نے اسے خواب سمجھا ہوگا۔ دوپہر کی گرمی کو دور کرنے کے لیے تناور درختوں کا سہارا لیا۔ اس لیے اسے پسند کیا۔ پھولوں کی خوشبو نے اسے معطر کیا تو اسے مسرت محسوس ہوئی۔ کانٹوں نے اسے تکلیف پہنچائی تو ان پر غصہ آیا۔ غرض اس طرح اس نے اچھے اور برے میں تمیز کرنا سیکھا۔ یہیں سے اس کے ذہن میں تنقیدی شعور ہوا اس وقت نہ تو کوئی زبان تھی نہ کوئی تہذیب اس لیے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انسان تنقید کا شعور لے کر پیدا ہوا اور جسے تہذیب کے سورج کی گرمی اور روشنی زمین کو سنوارتی اور بناتی گئی۔ ویسے ویسے تنقید کا شعور بھی ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا اور جب تہذیب نے ایک جامہ پہن لیا اور انسان اپنے احساسات کی ترجمانی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بات چیت کرنا شروع کی تو تنقید نے ایک شکل اختیار کرنا شروع کی۔

اگر ہم قدیم زمانے کے ادب پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی ادب دنیا کا قدیم ترین ادب ہے۔ یونانی قوم نے اس زمانے میں علم وفن اور تہذیب وتمدن میں اپنی معراج کو پالیا تھا۔ جب دنیا جہالت میں تھی، یونان میں علم وحکمت بام عروج پر تھی۔ تنقید اور اس کا معیار بھی سب سے پہلے یونانی ادب میں ملتا ہے اور تنقید کا پہلا اشارہ یونان کے قدیم ترین شاعر 'ہومر' کے ہاں ملتا ہے اس نے اپنی تصنیف 'اوڈیسی' میں لکھا ہے کہ:

''اس مقدس مطرب 'ڈیموڈوکس' کو بلاؤ کیونکہ خدا نے اسے جیسی گانے کی صلاحیت دی ہے کسی اور کو نہیں دی اس لیے کہ جسے اس کا دل چاہے اس طرح گا کر انسانوں کو خوش کرے۔'' (بحوالہ: بوطیقا، ص 3، تمہید)

یونانیوں نے سب سے پہلے ادب وتنقید پر روشنی ڈالی اور اس کو معراج کمال تک پہنچایا۔ پروفیسر بوچر نے افلاطون کی تنقیدی بصیرت کی داد دی، اور افلاطون نے سب سے پہلے فلسفیانہ تنقید پر روشنی ڈالی اور اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس نے لکھا:

''افلاطون کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وسیع اور فلسفیانہ تنقید کا سنگ بنیاد رکھا جو علم وادب کی روح ہے۔'' (بحوالہ: روح تنقید، ڈاکٹر زور، ص 160)

تنقید پر ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف تنقیدی رجحانات کا پتہ چلتا ہے بلکہ اصول نقد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عزیز احمد نے بوطیقا کی تمہید میں لکھا:

''جہاں تک خالص تنقید کا تعلق ہے معلم اول کا یہ شاہکار دنیا بھر میں بے مثل ہے۔''

(بحوالہ: بوطیقا ارسطو مترجمہ عزیز احمد، ص 32)

ارسطو نے ادبی فن پاروں کو پرکھنے کے لیے جو اصول معین کیے وہ بے پناہ تنقیدی صلاحیت کا ثبوت ہے رزمیہ المیہ اور طربیہ پر اس نے جس طرح بحث کی ہے وہ تنقید کا بہت بڑا شاہکار ہے۔ ارسطو نے پہلی بار المیہ وطربیہ شاعری پر تنقیدی بحث کی، یہ المیہ کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس سے اخلاق کا درس ہے۔ اس طرح تنقید یونان میں پہلی بار باقاعدہ شکل میں آئی۔

عربی ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اسلام سے پہلے بھی جب تہذیب وتمدن نام کی کوئی چیز کا وجود نہ تھا۔ بہترین شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اصول اور قاعدہ بھی مقرر کیے تھے جس کی بنا پر وہ اچھی اور بری شاعری میں فرق کرتے تھے۔ وہ شاعری میں طرز بیان کو سب سے زیادہ ترجیح دیتے۔ ابن رشیق نے اپنی کتاب 'کتاب العمدہ' میں جدت اور طرز اور ندرت بیان پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔

''ادائے ندرت معنی کیلئے نئے انداز نکالنا اور ایک ایک بات کو کئی طرح ادا کرنا شاعرانہ کمال ہے۔''

(اردو تنقید کی تاریخ، مسیح الزماں، ص 10)

اس زمانے میں تنقید کا باقاعدہ وجود نہ تھا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ اصول نقد موجود تھے۔ مثلاً ابن خلدون نے تنقید کے اس طریقے کو ضروری سمجھا اور لکھا ہے:

''جب اشعار نظم کرلیں اور فراغت مل جائے تو خود اپنے اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیے۔''

(مقدمہ ابن خلدون، ص 591)

ایرانی نقادوں نے شاعری کو صرف احساسات کی ترجمانی اور جذبات کی شدت بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہی نہیں سمجھا بلکہ انداز بیان کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ ایران کی ابتدائی شاعری میں عروض وظاہری خوبیوں کو شروع ہی سے زیادہ اہمیت حاصل رہی:

''شمس قیس رازی نے اس بات سے بحث کی کہ شاعری اور تنقید الگ الگ چیزیں ہیں اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ اچھا شاعر اور اچھا نقاد یا اچھا نقاد اچھا شاعر بھی ہو۔''

(شمس قیس رازی کتاب المعجم، بحوالہ اردو تنقید کی تاریخ مصنف مسیح الزماں)

اس نے پہلی بار تنقید کو فن کی حیثیت سے محسوس کیا۔

سنسکرت ادب بھی دنیا کے قدیم ادب میں شمار ہوتا ہے۔ جس طرح تمام زبانوں میں زبان کی ابتدا شاعری سے ہوئی اسی طرح سنسکرت میں بھی اس کے ابتدائی نقوش شاعری کی صورت میں ملتے ہیں۔ جس طرح تنقید کی باقاعدہ ابتدا ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' سے ہوئی اسی طرح سنسکرت میں بھی تنقیدی شعور کا اندازہ ناٹیہ شاستر سے ہوتا ہے۔ اس زمانے میں تنقید میں فن بلاغت، علم بیان معانی اور علم بدیع پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سنسکرت میں شاعری کے تقریباً وہی اصول نظر آتے ہیں جو یونانی ادب میں نظر آتے ہیں۔ ساہتیہ درپن میں وشواناتھ نے شاعری کی تعریف میں لکھا:

''وہ کلام جس سے لذت حاصل ہو یعنی جذبات اور لذت کا ہونا شعر کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔''

(ساہتیہ درپن از: وشواناتھ، ترجمہ سالک رام شاستری، ص 13)

اس کے علاوہ بھاؤ کو سنسکرت شاعری میں بہت اہم قرار دیا۔ شاعری کے مقصد کے لیے سنسکرت میں بعض شعرا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس سے ان کے تنقیدی شعور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً سنسکرت کے مشہور عالم ممٹ نے لکھا ہے: ''شبدارتھو کاویم'' یعنی لفظ و معانی ہی شاعری ہے اس لیے لفظ کبھی معانی سے جدا نہیں ہوتا اس طرح ناٹیہ شاستر کے مصنف بھرت نے بہتر شاعری کے لیے سب سے زیادہ اہم رسوں کو بتایا ہے۔

مغربی ادب کا تنقیدی شعور ایک طویل عرصہ تک ارسطو کے بنائے ہوئے تنقیدی اصولوں سے بہت زیادہ متاثر رہا۔ جس کی تحریک ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' سے ہوئی۔ تنقید کے ارتقاء کی تاریخ میں اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کی تیسری دہائی کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں تنقید کے تمام بنیادی مسائل سامنے آئے جو کہ آج بھی نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں تنقید کا ایک ایک اہم رجحان نو کلاسکیت سے شروع ہوا جس نے تنقید میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔ یہ تحریک اٹلی اور فرانس میں سولہویں صدی میں شروع ہوئی۔ یہ تحریک کلاسکیت تحریک سے وراثت میں آئی۔ اس تنقید میں نئے رجحانات کو قبول کیا گیا۔ جو کہ بعد میں رومانی کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ نو کلاسکیت تنقید کے عام اصول شائستگی یا ظاہری آرائش عام روایات اور اصول ہیں۔ نو کلاسیکی کے نظریہ کی بنیاد Imitation of Nature پر ہے۔

نو کلاسیکی تنقید کی ارتقا میں جان ڈرائڈن کو اہمیت ہے۔ ڈرائڈن پہلا شاعر ہے جس نے اپنی تحریروں میں نو کلاسکیت کے اصول پیش کیے اس میں شاعری طنز و مزاح ڈرامہ پر تنقیدی مضامین لکھے۔ مختلف اصناف کے ذریعے نو کلاسکیت کے نظریے کو پیش کیا۔ ویلک نو کلاسکیت تنقید کا نمائندہ تھا۔

کلاسیکی حقیقت پسندی کے بعد تنقید میں رومانی تحریک کی ابتداء ہوئی۔ یہ ایک رومانی تحریک تھی۔ اس نے تمام پرانے روایات سے بغاوت کی اور ادب کے اصولوں کو ازسرنو ترتیب دیا۔

> جس طرح تنقید کی باقاعدہ ابتدا ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' سے ہوئی اسی طرح سنسکرت میں بھی تنقیدی شعور کا اندازہ ناٹیہ شاستر سے ہوتا ہے۔

رومانیت کی بنیاد تصوریت اور ماورائیت پر ہے۔ اسی لیے اس میں میانہ روی کی گنجائش نہیں ہے۔ رومانوی ادیبوں کے یہاں جذباتی انتہاپسندی ہے ان کا احساس بہت شدید اور تصور بہت بلند ہے۔ ہیگل کے فلسفے نے رومانیت کے راستے کو ہموار کرنے میں بڑی مدد دی اس لیے کہ اس کے یہاں بھی تصوریت اور ماورائیت کی بہتاب ہے۔ شوپنہار کا فلسفہ جمالیات اور فلسفہ غم بھی رومانی تصور ہے۔

تنقید میں رومانی تحریک جرمن سے شروع ہوئی تھی جو بہت جلد انگلستان اور فرانس میں پہنچی۔ اس تحریک کو عام کرنے میں ٹین (Taine) اور سینٹ بیو نے سب سے زیادہ کام کیا۔

تنقیدی رجحانات عام طور پر حالات اور واقعات کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ رومانی تنقید سے جدید تنقید کی ابتداء ہوئی اس لیے کہ اس زمانے میں تنقید میں فلسفیانہ نفسیاتی اور جمالیاتی تنقید پر زور دیا گیا۔ بعض لوگوں نے کسی بھی فن پارے کا معیار اس سے حاصل ہونے والی ذہنی سکون پر رکھا۔ تو بعض نے اس کی سماجی اہمیت پر زور دیا۔ کچھ لوگوں نے سائنٹفک کی ابتداء کی تو کچھ لوگوں نے ادب میں فنی خصوصیات جمع کر کے جمالیات تنقید کی بنیاد ڈالی۔ سائنٹفک تنقید ادیب اور فنکار کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے اس میں اس زمانے کے سماجی حالات اور خیالات کا گہرا عکس دکھائی دیتا ہے۔

سائنٹفک کے ابتدائی نقوش ٹین کے یہاں ملتے ہیں۔ حالات و نظریات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تنقید کی راہیں بھی بدلتی گئیں۔ کچھ لوگوں نے ادب کے مطالعہ میں تاریخ کی اہمیت پر زور دے کر تاریخی تنقید کی ابتداء کی جس کے تحت سیاسی و عمرانی اثرات کا بھی مطالعہ کیا۔ اس طرح نفسیاتی اور سوانحی تنقید کا بھی وجود ہوا۔ انیسویں صدی میں تنقید میں بہت سے نئے رجحانات آنے لگے۔ سائنٹفک تنقید نے جن باتوں پر اپنی بنیاد رکھی انہی سے تنقید کی ایک نئی شاخ جمالیاتی تنقید بھی نکلی جس میں جمالیاتی اقدار پر زور دیا:

''مجنوں گورکھپوری کا بیان ہے جمالیات فلسفہ ہے حسن و فن کاری کا۔''

(تاریخ جمالیات، مجنوں گورکھپوری، ص 12)

جمالیاتی تنقید کے اولین نقادوں میں والٹر پیٹر کا نام لیا جاتا ہے۔

تنقید کے اس نظریے میں مسرت اور حسن کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جمالیاتی نقاد کسی بھی فنی تخلیق میں سب سے زیادہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ کہاں تک حظ پہنچاتی ہے۔ جمالیاتی تنقید سے ایک شاخ تاثراتی تنقید کی نکلی۔ جمالیاتی تنقید میں جب حد درجہ داخلیت پیدا ہوجاتی ہے تو تاثراتی تنقید بن جاتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں صرف ان باتوں پر نگاہ رکھی جاتی ہے کہ کسی بھی ادبی تخلیق کے مطالعے کے وقت ذہن پر کونسا وجدانی اثر طاری ہوتا ہے۔ وہی تاثر اس تخلیق کے اقدار کو متعین کرتا ہے۔

امریکی نقاد اسپنگارن جس نے تاثراتی تنقید کو تخلیقی تنقید کا نام دیا ہے۔ والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ اسی دبستان کے علمبرداروں میں سے ہے تاثراتی تنقید میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کسی تخلیق کے مطالعے سے نقاد کے ذہن پر کیا اثر پڑتا ہے۔

جدید دور میں ادب میں سماجی نقطۂ نظر پر زور دیا گیا ہے۔ نقاد یہ دیکھتا ہے کہ ادبی تخلیقات میں فنکار نے کس زاویہ سے سماجی مسائل پر روشنی ڈالی۔ اس کا انداز فکر کیا ہے۔ وہ کس طبقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح تنقید کا سلسلہ معاشیات، نفسیات، سیاسیات اور دوسرے علوم سے مل گیا۔ تنقید کا کام ادب کی ترجمانی کرنا ہے اور اس کے محاسن اور اقدار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ جدید تنقید میں ایک باقاعدہ اسکول مارکسی نقادوں

کا ملتا ہے جس نے ادب اور سماج کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ مارکسی ناقدین کا خیال ہے کہ ادب کی تخلیق کے لیے دوسرے علوم کا سہارا لینا ضروری ہے۔ ادب زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ سماجی مارکسی تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب اور زندگی کے متعلق اس کی افادیت پر زور دیا ہے۔

جدید تنقید نگاری میں نفسیاتی تنقید کا ایک اہم رجحان ملتا ہے جس کی باقاعدہ ابتدا فرائڈ سے ہوتی ہے اس نظریے کے تحت سب سے زیادہ زور فرد پر دیا جاتا ہے اور ادب کو خالق کی نفسیاتی الجھنوں اور تشنگیوں کی تصویر بنایا جاتا ہے۔ جدید نفسیات کی مقبولیت فرائڈ کی تحریروں خصوصاً اس کے فلسفۂ تحلیل نفسی سے ہوتا ہے۔ فرائڈ نے خواب کی تعبیر و تشریح کی اور بتایا کہ خواب کی طرح ادب بھی ہماری ناکامیوں کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ نفسیاتی فلسفیانہ، ادبی اور سماجی تحریکوں کا اثر عالمگیر صورت میں ظاہر ہوا ان اور تحریکات نے مشرق اور خصوصیت سے ہندوستانی ادب کو بھی متاثر کیا۔ ہندوستانی سماج کے تنقیدی نظریات میں اس قسم کے تحریکات نظر آتے ہیں۔ ’’سرسید نے سب سے پہلے فکر کو ایک سائنسی نقطۂ نظر دیا اور چیزوں کو پرکھنے کے لیے تنقیدی نظریہ عطا کیا۔ یہ سرسید ہی کی دین تھی کہ تنقیدی شعور نے صدیوں کی راہ ایک جست میں طے کرلی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تنقید ایک دم تذکروں سے نکل کر آب حیات کے دائرے میں آگئی۔ یہ بہت بڑی ترقی تھی۔ دوسرے تذکروں کے مقابلے میں ’’آب حیات‘‘ میں باقاعدہ تنقیدی رجحان اور اصول ملتے ہیں۔ آزاد کا اصول تمثیلی ضروری ہے۔

لیکن انھوں نے اپنے خاص انداز میں شاعری کا تجزیہ کرکے ادبی پرکھ کا ایک نیا طریقہ اور معیار متعین کیا۔ اس ضمن میں آب حیات کے علاوہ نیرنگ خیالات کا مقدمہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات کا شعور ملتا ہے اور ان حالات کے پیش نظر نئی ادبی روایتوں کی تدوین کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ آب حیات کے بعد مقدمہ شعر و شاعری اس سے زیادہ اہم قدم تھا چوں کہ انیسویں صدی کے آخری نصف حصے میں ہندوستان میں بہت سی نئی چیزیں آئیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس زمانے میں پورا نظام حیات بدل گیا۔ اس لیے تنقیدی شعور اور ادبیات میں تبدیلی کا ہونا لازمی تھا جو نئے تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اردو ادب میں ابتدائی تنقیدی اشارے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکروں میں ان تنقیدی اشاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل ہماری جدید تنقید کی بنیاد ہی اشارے ہیں۔ تذکرہ نگار جس شاعر کا ذکر کرتا ہے اس کے کلام پر خود ہی رائے دیتا ہے۔ تنقیدی شعور کا یہ سلسلہ شعرا کے کلام سے تذکروں تک پہنچتا ہے۔ اسے تنقیدی شعور کی ابتدا کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ تنقیدی شعور کی بہت سی مثالیں شاعروں کے کلام تقریضوں اور خطوط میں مل جاتے ہیں۔ تذکروں کے فوراً بعد آب حیات کا نام آتا ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو سب سے پہلے جدید تنقیدی خیالات کا اظہار آزاد ہی نے کیا۔ آب حیات میں شاعری کے مختلف موضوعات پر بحث کی۔ اس میں شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ بھی ملتا ہے۔ آب حیات کی تنقید غیر جانبدارانہ نہیں ہے۔ پھر بھی اسے تنقید سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ آب حیات کو ہم صرف تذکرہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس میں اور دوسرے تذکروں کے انداز میں خاصا فرق ہے۔ آب حیات دراصل ہماری پہلی ادبی تاریخ ہے جس میں تذکرے کی خصوصیت اور تنقید بھی ہے۔

مغربی اثرات میں آزاد، حالی، سرسید اور شبلی نے سب کو متاثر کیا۔ یہاں اردو تنقید تعریف و توصیف کے دائرے سے نکل کر سماجی اور نفسیاتی تجزیے کے حدود میں داخل ہوئی۔ ادب میں زندگی اور مقصدیت کا وجود عمل میں آیا۔ جس نے تنقید کو نئے اور زندہ اصول دیے ہیئت اور اسلوب کے ساتھ مواد اور موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اس طرح اردو ادب میں رومانی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، مارکسی تنقید اور سائنٹفک تنقید وجود میں آئی۔

اردو میں جمالیاتی و تاثراتی تنقید

جمالیاتی تنقید کا مقصد ادبی فن پاروں میں مسرت و حسن کے اجزا کو تلاش کرتا ہے۔ چونکہ جمالیات فنون لطیفہ کے بارے میں اظہار خیال کرتی ہے اس لیے اس کو فلسفہ فن کہا گیا ہے۔ ادب ایک ایسا فن ہے جس کا کام تخلیق حسن ہے جو کہ دائمی مسرت کا باعث ہوتا ہے اس لیے فنکار کی طرح نقاد بھی اس تخلیق کی تکنک میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اردو میں جب ہم جمالیاتی تنقید کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مختلف نقادوں کے یہاں ایسے رجحانات اور اشارے مل جاتے ہیں جو اردو میں جمالیاتی تنقید و تاثراتی تنقید کی شکل میں ملتی ہے۔ ان نقادوں میں آزاد، شبلی، مہدی افادی، سجاد انصاری، عبدالرحمن بجنوری، اثر لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری اور حسن عسکری کے نام اہم ہیں۔

سائنٹفک تنقید

انیسویں صدی کے درمیان ہی میں ٹین کے تاریخی نظریے کے ساتھ سماجی نظریہ پیدا ہوا جس کی ابتدا مارکس اور ہیگل نے کی۔ حقیقت میں سماجی رجحان ٹین کے نظریہ نسل زمانہ اور ماحول پر زور دینے سے شروع ہوا۔

جدید سماجی نظریہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ مارکسی تنقید کی ابتدا مارکس سے شروع ہوتی ہے۔ ادب انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس کے خیالات اور جذبات بنیادی تجربات پر ہوتی ہے۔ جب ہم ادب کے لیے یہ بات کہتے ہیں تو اس کا سلسلہ زندگی اور اس کی مادی حالت میں مل جاتا ہے۔ ادب اور فن کا ارتقا خلا میں وجود رکھنے والا خودمختار عمل نہیں ہے ایسی تخلیقات ان ہی روایات اور سماجی ماحول سے وابستہ ہوتی ہے جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ جن حالات سے اس کی زندگی دوچار ہوتی ہے۔ ادب کو زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے۔ فنکار اپنے طبقہ اور زمانہ کا عکاس ہوتا ہے۔ مارکسی تنقید نہ تو فنی صنعت گری کے خلاف ہے نہ جمالیاتی احساسات اور نہ حسن کے خلاف بہتر مارکسی تنقید ایک اچھے فن پارے میں احساسات کی رفعت جمالیات و تاثرات اور فنی اقدار کے شعور کو بھی دیکھتی ہے۔ جب ہم ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ادبی تخلیق کی پرکھ کرتے ہیں تو وہ صحیح معنوں میں سائنٹفک تنقید بن جاتی ہے۔ سائنٹفک تنقید کے نقادوں میں سب سے اہم نام حالی کا ملتا ہے۔ حالی نے ادب اور سماج کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔

انھوں نے سب سے زیادہ مغرب کا اثر قبول کیا۔ ان کے تنقیدی شعور میں وہ پختگی نظر آتی ہے جو اس دور کے دوسرے نقادوں کے یہاں نظر نہیں آتی۔ تاثراتی اور سائنٹفک نقادوں میں اہم نام اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، احتشام حسین، اختر انصاری، سردار جعفری، ممتاز حسین، جسارت بریلوی، ظ۔ انصاری، محمد حسن اور قمر رئیس کے ہیں۔

■

Dr. Mohd Khwaja Makhdoom Mohiuddin
Asst. Professor/ Incharge Head Dept of Urdu
Dr. B R Ambedkar Open University
Hyderabad- 500033 (Telangana)
Mob.:9849402769
maqdoom_siasat@yahoo.com

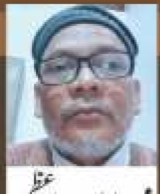

محمد الیاس الاعظمی

ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی

مولانا ابوالقاسم فضل رب عرشی کا وطن ضلع اعظم گڑھ کا ایک غیر معروف گاؤں تاج پور ہے۔اسی کی جانب نسبت سے وہ تاج پوری لکھتے تھے۔موضع تاج پور ضلع اعظم گڑھ میں شاہراہ بنارس پر موضع قلندر پور کے مغرب میں واقع ہے۔شہر سے تقریباً 25رکلومیٹر کی مسافت ہوگی۔

مولانا ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی تاجپوری ابن حکیم مولوی شیخ امام علی اپنے عہد کے ایک ممتاز شاعر وادیب اور عالم ومصنف تھے۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے۔ فارسی کے تو نہایت ممتاز اور قادرالکلام شاعر تھے اور اسی کمالات شعری اور مہارت فنی کے سبب وہ نظام حیدرآباد دکن میر محبوب علی خاں (1866-1911) کے دربار سے بحیثیت شاعر وابستہ ہوئے۔ پچاسی سال کی طویل عمر پائی۔ 1309ھ/1892 میں حیدرآباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عرشی کا مذکورہ بالا سنہ وفات درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ یہی سنہ وفات 1309ھ ابوتراب محمد عبدالجبار خاں براری نے بھی اپنی کتاب 'محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن (ج 2، ص 808) درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''فقیر مولف کو سنہ وفات میں شک معلوم ہوتا ہے۔ تخمین و قیاس سے لکھا گیا ہے۔'' ماہر دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'داستان ادب اردو' (ص: 158) میں یہی سنہ وفات قطعیت سے لکھا ہے، لیکن یہ سنہ وفات اس لیے بھی صحیح نہیں ہے (1309ھ 92-1891) کے دوسال بعد 1894 میں نواب میر محبوب علی خاں نے ندوۃ العلما کے اجلاس لکھنؤ میں شرکت کے لیے حکومت حیدرآباد دکن کی جانب سے جو وفد بھیجا تھا اس کے ایک رکن مولانا محمد فضل رب عرشی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے 1894 کے اجلاس میں شرکت کی اور غالباً قصیدہ بھی پیش کیا۔ (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ، مئی 1895، ص184)

اس لیے 1309ھ/92-1891 سنہ وفات قطعی طور پر درست نہیں ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953) نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالقاسم عرشی نے کم عمری میں انتقال کیا۔ (حیات شبلی، ص256)

مگر مولانا محمد فضل رب عرشی کے حیدرآبادی دوست اور صاحب تذکرہ 'محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن' نے لکھا ہے کہ پچاسی سال کی عمر پائی۔ (ج2، ص808) ان کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ علامہ شبلی کے ایک شاگرد مولوی مسعود علی محوی 1889 میں علی گڑھ کالج سے تکمیل کے بعد 1890 میں حکومت حیدرآباد میں ملازم ہوئے اور آخر تک وہاں رہے۔ انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں مولوی فضل رب عرشی کے علم وفضل اور شاعرانہ کمالات کا ذکر کیا ہے۔ تاہم تلاش وجستجو کے باوجود ان کی تاریخ ولادت ووفات معلوم نہ ہو سکی۔

مولانا ابوالقاسم فضل رب عرشی کا وطن ضلع اعظم گڑھ کا ایک غیر معروف گاؤں تاج پور ہے۔ اسی کی جانب نسبت سے وہ تاج پوری لکھتے تھے۔ موضع تاج پور ضلع اعظم گڑھ میں شاہراہ بنارس پر موضع قلندر پور کے مغرب میں واقع ہے۔ شہر سے تقریباً 25رکلومیٹر کی مسافت ہوگی۔

مولانا عرشی کا ننھیال شاہ فتح محمد قلندرؒ کا مدفن موضع قلندر پور ضلع اعظم گڑھ میں تھا۔ ان کی والدہ کا نام اہلیت بی بی، نانا کا نام شاہ باقر علی اور نانی کا نام سموبابی بی بنت سید فقیر حسین تھا۔ نانی کا میکا جہانیاں پور (نزد پوروا، سریتا) اعظم گڑھ میں تھا۔ ان کی خالہ بھی قلندر پور ہی میں تھیں۔ سلسلہ قلندریہ کے ایک بزرگ مولوی شاہ محمد یٰسین بن حکیم شاہ راحت علی قلندر پوری ان کے خالہ زاد بھائی تھے اور شاگرد بھی۔ انھوں نے متوسطات تک کی کتابیں انھی مولانا فضل رب عرشی سے پڑھی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا عرشی تاجپوری ترک سکونت سے پہلے وطن میں درس وتدریس کا سلسلہ رکھتے تھے، لیکن مولوی محمد یٰسین قلندر پوری کے علاوہ اور کون سے طلبہ نے ان کے چشمہ فیض سے اپنی تشنگی بجھائی، اس کا علم نہیں ہو سکا۔

مولانا عرشی کے دو اور بھائی عبدالحق اور عبدالقدوس تھے۔ ایک بہن بھی تھیں، جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مولانا عرشی کی شادی شیخ لال محمد ساکن خطیب پور (ضلع اعظم گڑھ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔

مولانا عرشی اپنے وطن تاج پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کے معاصر تذکرہ نگار مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار خاں ملکاپوری براری حیدرآبادی صدر مدرس عربی و فارسی مدرسہ اعزہ نے لکھا ہے کہ:

''آپ نے وطن مالوفہ میں تربیت و پرورش پائی، سن شعور کے بعد علماء و فضلا کی خدمت میں کتب فارسیہ و عربیہ کی تحصیل کی، ہم عصروں میں لائق و فائق ہوئے، طبیعت میں موزونیت و جولانی خداداد تھی، چستی و چالاکی از حد تھی، شعر گوئی کا شوق دل میں موجزن اور سخن سنجی کا شعلہ زن ہوا، طبیعت والا و فکر رسا کے زور سے کلام موزوں کرنے لگے، کلام سنجیدہ و پسندیدہ ہونے لگا۔''

(محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن، ج2، ص805)

مولانا عرشی کے اساتذہ کا نام بھی پردۂ خفا میں ہے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اعظم گڑھ میں انھوں نے کس جگہ اور کن علما سے تحصیل علم و ادب کیا اور کون کون سے علوم حاصل کیے۔ اسی طرح شعر و شاعری میں انھیں کس سے تلمذ حاصل تھا اور آپ نے کس سے اصلاح سخن لی، یہ تمام تفصیلات پردۂ راز میں ہیں۔ البتہ شعر و سخن میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اس کے رموز و آداب سے بخوبی واقف تھے۔

مولانا فضل رب عرشی تلاش معاش میں وطن اعظم گڑھ سے نکلے اور مہاراجہ گوالیار کے صاحب زادے کے اتالیق مقرر ہوئے، لیکن مزاج کی وارفتگی نے تمام تر عزت و تکریم کے باوجود وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ مولوی ابوتراب نے لکھا ہے کہ:

''چند مدت تک مولانا ریاست گوالیار میں مقیم رہے۔ مہاراجہ کے صاحبزادے کے ادب آموز تھے۔ بڑی عزت و آبرو تھی مگر آپ کو ادب آموزی سے نہایت نفرت تھی، کیونکہ آپ کا مزاج آزادگی پسند قید و تعلق سے دوری چاہتا تھا۔ خود ہی وہاں کا تعلق چھوڑ کر نواب لائق علی خاں مختار الملک ثانی کے زمانہ میں حیدرآباد دکن وارد ہوئے۔'' (ج2، ص806)

حیدرآباد آئے تو قسمت نے یاوری نہیں کی حضور نظام اور مدار المہام کی شان میں قصائد لکھے مگر ان کے التفات سے محروم رہے۔ مولوی ابوتراب کے بقول اس کا سبب یہ تھا کہ:

''یہاں بعض نے غلطی یا شاعرانہ تقابل کی وجہ سے آپ کو مطعون کیا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں یہ آپ کا طبع زاد نہیں ہے۔ شاید متقدمین میں جو اس تخلص کا شاعر نامی عرشی گذرا ہے اس کا دیوان آپ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ آپ یہ جو جوہر افشانی کرتے ہیں اسی کی بدولت کرتے ہیں۔ آپ بھی معترض کے اعتراض سے واقف ہوئے۔''

(محبوب الزمن تذکرہ شعرئے دکن، ج2، ص806)

چند مدت تک مولانا ریاست گوالیار میں مقیم رہے۔ مہاراجہ کے صاحبزادے کے ادب آموز تھے۔ بڑی عزت و آبرو تھی مگر آپ کو ادب آموزی سے نہایت نفرت تھی، کیونکہ آپ کا مزاج آزادگی پسند قید و تعلق سے دوری چاہتا تھا۔ خود ہی وہاں کا تعلق چھوڑ کر نواب لائق علی خاں مختار الملک ثانی کے زمانہ میں حیدرآباد دکن وارد ہوئے۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ ایک روز دربار ہی میں معترض سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی کیفیت صاحب محبوب الزمن نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''ایک روز حسن اتفاق سے آپ مدار المہام کے سلام کے لیے گئے، معترض بھی دربار میں باریاب تھے۔ اس وقت آپ کی شاعری کی بابت تذکرہ شروع ہوا۔ معترض نے وہی اپنی ہٹ دھرمی شروع کی اور یہ کہا کہ اگر آپ فی البدیہہ چند اشعار ہماری خواہش کے موافق سنگلاخ زمین میں کہہ دیں تو ہم اپنے اعتراضات و طعن سے اعراض کریں گے اور آپ کی واقعی کی لیاقت و استعداد کا اقرار۔ آپ نے نہایت خوشی سے اس امر کو منظور کیا اور معترض صاحب کی (دی ہوئی) طرح پر اسی وقت چند اشعار فی البدیہہ کہہ دیے۔ نواب صاحب اور اہل مجلس آپ کی استعداد کے قائل ہوئے اور معترض صاحب پژمردہ خاطر۔ نواب صاحب نے معترض صاحب سے مخاطب ہو کر کہا فرمائیے اب آپ کیا کہتے ہیں۔ معترض صاحب نے نہایت ندامت کے ساتھ آہستہ لب سے کہا کہ اس شخص کی واقعی لیاقت اس کلام کے لائق نہیں۔ ضرور کوئی بیاض قدیمہ ان کے پاس ہوگی۔'' (ایضاً، ج2، ص807)

مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار براری نے معترض کا نام درج نہیں کیا ہے۔ البتہ مولانا عرشی پر اس کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''افسوس معترض نے آپ کے معاملے میں بڑی بے انصافی کی۔ صریحاً معترض کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ اب اس مقام پر فقیر مولف انصافاً گزارش کرتا ہے کہ معترض کا اعتراض اس قسم کا تھا کہ لا اصل لہ، کیونکہ متقدمین میں دو عرشی گذرے ہیں، ان دونوں کا کلام میرے پاس موجود ہے۔ جناب عرشی صاحب ترجمہ اور ایک عرشی متقدمین کے کلام میں اس قدر فرق ہے کہ عرش و فرش ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

متقدمین اور آپ کی طرز میں زمین و آسمان کا فرق ہے ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

آپ اکثر قصائد سنگلاخ زمین میں کہتے ہیں۔ ترصیع و تجنیع کا زیادہ لحاظ فرماتے ہیں۔ متقدمین کے کلام میں یہ صفت نہیں ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ متقدمین کے چند اشعار اس مقام میں نقل کروں تاکہ ہمارے کلام کی پوری پوری تصدیق ہوجائے لیکن افسوس کہ متقدمین کے دیوان موسی ندی کی طغیانی میں نذر سیلاب ہوگئے اس وجہ سے معذور ہوں۔'' (ایضاً ج2، ص:807)

ان ظالمانہ روش کی وجہ سے مولانا عرشی ایک مدت تک دربار نظام حیدرآباد سے وابستہ اور وظیفہ حاصل نہیں کر سکے اور پریشان حال رہے، تاہم انھوں نے صبر و شکر اور استقامت کا دامن نہیں چھوڑا، مولوی ابوتراب نے اس کی کیفیت بھی سپرد قلم کی ہے، بعد ازاں نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کی جانب سے وظیفے کی منظوری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''جناب عرشی' صاحب ترجمہ' انھیں موانع وعوائق کی وجہ سے چندمدت پریشان و پراگندہ حال رہے مگر آپ مستقل مزاج وثابت قدم تھے۔ اپنے استقلال وثبات میں ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ نہایت ہشاش وبشاش رہے۔ یاران ہم مشرب کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کسی دوست ورفیق سے شکایت نہیں کی اور نہ اپنی حالت بیان کی۔ حبل المتین صبر کو ہاتھ میں تھامے ہوئے خدا پر توکل کیے ہوئے تھے کہ اسی صبر توکل کی برکت سے بندگان عالی حضور پرنور نے نہایت قدردانی سے آپ کے لیے بقدر مایحتاج ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا منصب مقرر کردیا تھا۔ بہرحال عدم مطلق سے بہتر تھا، مگر آپ کی فیاضی وسیرچشمی کے لحاظ خاص اس شہر میں یہ مقدار آپ کے لیے کافی نہیں تھی۔ آپ اسی وظیفہ پر شاکر وقانع رہے۔'' (ایضاً ج2،ص807-808)

مولانا عرشی کے ساتھ یہ ظلم وزیادتی محض ان کی زندگی ہی میں نہیں روا رکھی گئی بلکہ بعد از مرگ بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے 'حیات شبلی' میں بیاض شبلی کے غائب ہوجانے کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں یہ بات بھی لکھی ہے کہ:

''مولانا شبلی کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے، ان کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولانا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی اور وہ وہاں سے غائب ہوگئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم عرشی مرحوم پر شبہ تھا جو بعد کو حیدرآباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہوگئے تھے اور جوانی ہی میں وفات پائی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ انہی نظموں کو حیدرآباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے۔'' (حیات شبلی،ص255-56)

اس متن کے حاشیے میں سید صاحب نے یہ وضاحت بھی کی ہے ''یہ روایت میں نے جناب خواجہ سید رشیدالدین صاحب (برادر نسبتی نواب سید علی حسن خاں، لکھنؤ) سے سنی، جو مولانا (شبلی) کے پرانے دوست ہیں۔'' (حیات شبلی، حاشیہ،ص256)

اس طرح گویا یہ سرقہ کے الزام کی ذلت حیدرآباد سے ان کے وطن اعظم گڑھ تک پہنچ گئی۔ اوپر مولوی ابوتراب براری کی تردید نقل کی جاچکی ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم پر شبہ

مولانافضل رب عرشی کے اصل کمالات کا میدان ان کی فارسی شاعری ہے ، لیکن ان کا فارسی کلام بھی دستیاب نہیں ہے ۔ محض دو قصیدے ہاتھ آئے ہیں جنہیں اس مضمون کے آخر میں نقل کیا گیا ہے ۔

کرسکوں۔ البتہ یہ سنی سنائی بے تکی روایت حیات شبلی میں شامل نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مذکورہ اقتباس میں غازی پور کے نوجوان فارسی شاعر کا ذکر ہے، جبکہ مولانا عرشی تاج پور ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ تھے۔ علامہ شبلی کے ہم وطن اور معاصر تھے۔ اس وقت نوجوان بھی نہیں تھے۔ غازی پور سے ان کی کسی نسبت کا ذکر نہیں ملتا۔ مشاہیر غازی پور سے متعلق کتابیں بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ گویا عرشی مرحوم کے متعلق نہ صرف حیدرآبادی معترض کی معلومات درست نہیں تھیں بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی کی بھی معلومات تحقیق سے پرے ہے۔

مولانا محمد فضل رب عرشی کے دو قصائد ناچیز کی نظر سے گذرے ہیں اور جو اس مضمون کے آخر میں درج کیے گئے ہیں۔ ان میں 'قصیدہ مدوجزر اسلامی' ایک ترکیب بند اور قصیدہ منیر نواز جنگ کے چند اشعار شامل ہیں۔ علامہ شبلی کا کلام جس وقت غائب ہوا اس وقت وہ مذکورہ حیدرآبادی شخصیات سے سرے سے ناواقف نہیں تھے اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ علامہ ان کا قصیدہ لکھتے۔ ایک اور بات سید صاحب نے جہاں ابوالقاسم عرشی کا ذکر کیا ہے اس میں ان کی کم عمری میں موت کی بھی اطلاع دی ہے مگر مولانا ابوالقاسم فضل رب عرشی نے پچاسی سال کی طویل عمر پائی۔ بہرحال یہ ان کے ساتھ صریح ظلم وزیادتی ہوئی اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ ادبیات سے ان کا نام غائب ہے۔

مولانا عرشی کی شخصیت مختلف اوصاف سے عبارت تھی۔ مولوی ابوتراب نے اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ:

''آپ خوش خلق ونیک طینت ہیں۔ صاحب مروت وپسندیدہ سیرت ہیں۔ یاران ہم مشرب وہم مذاق سے نہایت محبت واشفاق سے ملتے ہیں۔ ظریف الطبع ولطیف المزاج ہیں۔ خوش تحریر وخوش تقریر ہیں، جس مجلس میں آپ ہوتے ہیں سب اہل مجلس آپ کو رونق مجلس سمجھتے ہیں۔ حاضرین مجلس آپ کی تقریر دل پذیر سے مزہ ولطف اٹھاتے ہیں۔ مولف فقیر کو بھی آپ سے نیاز ہے۔ کبھی کبھی مولوی مہدی علی خاں المخاطب نواب محسن الملک بہادر کے (حیدرآباد کے) دولت خانہ پر ملاقات ہوئی ہے مگر آپ نے سرسری ملاقات میں ایسا ثابت کردیا گویا ہمارے مدتوں کے رفیق ہیں۔''

(ایضاً ج2،ص806)

مولانا عرشی نے اردو وفارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کا اردو کلام دستیاب نہیں ہے۔ محض ان کے اردو کے دو شعر صاحب محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن نے جلد دوم میں نقل کیے ہیں۔

خوں بار ہوگی چشم کفن ہوگا خوں میں تر
پہچانا عدم میں مجھے اس نشان سے
میں اور نوید وصل فلک اور امید مہر
قاصد تری تو باتیں ہیں وہم وگمان سے

(محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن،ص809)

مولانا فضل رب عرشی کے اصل کمالات کا میدان ان کی فارسی شاعری ہے، لیکن ان کا فارسی کلام بھی دستیاب نہیں ہے۔ محض دو قصیدے ہاتھ آئے ہیں جنھیں اس مضمون کے آخر میں نقل کیا گیا ہے۔

مولانا عرشی کی فارسی شاعری کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے مگر جن لوگوں نے بھی قلم اٹھایا ان کے فکر وفن میں مہارت کی داد دی ہے۔

وہ عالم دین تھے۔ تاریخ اسلام اور مدوجزر اسلام سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ان کا قصیدہ 'مدوجزر اسلامی' اس کا شاہد ہے۔ یہ قصیدہ جلسہ باغ عامہ حیدرآباد دکن میں ایک تقریب میں اور ایک بڑے مجمع میں پڑھا گیا تھا، جس میں الگزنڈر رسل بھی شریک تھا۔ اس کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

رحمت یزداں اگر خواہی کہ بینے برزمیں
چشم خود اے قوم بکشا رحمت یزداں بہ بیں
اے مسلمانان زیزداں ہر کرامی خواستید
در دکن اینک فرود آمد چو باران برزمیں
نہ غلط گفتم کہ باران بر زمیں آمد فرود
رحمت حق زآسمان نازل شد اکنوں برزمیں
میزبانان صف زنید و دف زنید وکف زنید
کام دار دنیائے دیگر میہمانے ایں چنیں
صورت اسلام تازہ گر بخواہی بنگری
سرور نصرانیاں را در مسلمانان بہ بیں
دین حق را بر جبینش زد رقم کلک قضا
سودۂ گرد و برزمیں تا در سپاس حق جبیں

(کارنامہ عبرت،ص57)

اس قصیدے سے مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914) کی مدوجزر اسلام معروف بہ 'مسدس حالی' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ شاید مولانا عرشی کے ذہن پر بھی مولانا حالی کی مدوجزر اسلام سایہ فگن تھی۔ نام میں تو یکسانیت ہے ہی بہت سی معلومات اور خیالات بھی مستفاد معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ چونکہ مولانا عرشی کا قصیدہ فارسی میں ہے اس لیے پورے قصیدے پر قندپارسی ہی کی فضا غالب ہے۔ تاہم خیالات اور اصطلاحات میں جدت اور نیاپن ضرور معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد فضل رب عرشی تاجپوری نے اسی نوع کا ایک اور قصیدہ مختارالملک کے فرزند منیرالملک کے لیے کہا ہے مگر وہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے تین شعر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'داستان ادب اردو' میں نقل کیے ہیں:

بدشت دیگرے تازم بکوئے دیگرے نازم
بمدح سرورے سازم وہاج درج نورانی
ملک چہرہ فلک قدر و قیمت قضا صولت
بلبہا عیسی ثانی بعارض ماہ کنعانی
فلک گوہر فلک منظر قبا وافسر منیرالملک
کہ بر خوانش کند خورشید گردوں کاسہ گردانی

اپنے محسن کا اس قدر خوبصورت اعتراف اور اس کی منظرکشی قابل داد وتحسین ہے اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ قند پارسی میں انھیں نہایت مہارت ومشاقی اور درک حاصل تھا۔

مولانا عرشی کو نظم کے ساتھ نثرنگاری پر بھی قدرت حاصل تھی اور وہ اردو کے ایک پختہ ادیب اور اہل قلم تھے۔ انھوں نے کئی کتب ورسائل لکھے تھے مگر ان میں سے ایک کتاب 'کارنامہ عبرت' دستیاب ہوسکی، جو مطبع مفید عام آگرہ سے 1893 میں محمد قادر علی خاں کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے سرورق پر اس کا ایک سطری تعارف ان الفاظ میں لکھا ہوا ہے: ''یہ مضمون تجارت وصناعت علم وہنر اسلامی ایجادات اور اس کی ترقی اور تنزل کے اسباب سے متعلق ہے۔''

'کارنامہ عبرت' کا مختصر سا دیباچہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انتساب، وجہ تالیف اور محسن کی شکر گزاری کی تفصیل ہے، لیکن اس دیباچے کی نثر القاب وآداب اور غیر فطری لوازمات کے بوجھ سے دب کر ثقیل ہوگئی ہے۔

مولانا عرشی کو نظم کے ساتھ نثرنگاری پر بھی قدرت حاصل تھی اور وہ اردو کے ایک پختہ ادیب اور اہل قلم تھے۔ انھوں نے کئی کتب ورسائل لکھے تھے مگر ان میں سے ایک کتاب 'کارنامہ عبرت' دستیاب ہوسکی، جو مطبع مفید عام آگرہ سے 1893 میں محمد قادر علی خاں کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے۔

اسی طرح پورا دیباچہ احسان مندوں کے ذکر احسانات میں سراپا شکر واحسان بن کر ثقیل نثر کا ملمع ہوگیا ہے مگر مولانا عرشی کی نثر اصل کتاب میں ایسی نہیں ہے بلکہ بڑی سادہ و پرکار نثر ہے اور اس میں بڑی ادبیت، صفائی وسادگی اور سلاست ہے۔ خوبصورت تشبیہات اور استعارات نے اس میں اور بھی جاذبیت پیدا کردی ہے۔ جیسا کہ آئندہ جابجا درج اقتباسات سے بھی ظاہر ہوگا۔

'کارنامہ عبرت' کے تین اہم پہلو یا موضوعات ہیں۔ ایجاد۔ ترقی اور پھر زوال۔ انہی تینوں پہلوؤں کو تاریخ اسلام و دیگر تواریخ سے متعدد واقعات واعداد سے اپنے موقف کی تائید میں دلائل فراہم کیے گئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر مسلمانان عالم نے جو علمی وتعلیمی بالخصوص تجارتی ترقیاں کیں اور ترقی کے آسمان پر پہنچے اور پھر ان کی نااہلیت نے ثریا سے زمیں پہ دے مارا کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ مولانا عرشی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ تجارت پر بحث کرتے وقت مضمون نگار کا فرض منصبی ہے کہ تجارت کے ابتدائی زمانہ پر اول غور کرے کب اور کس سنہ میں اس نے ظہور پکڑا اور کیوں کر قدم بقدم آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچا کہ اپنی حیرت انگیز رفتار سے تمام عالم پر قبضہ کرلیا، تاریخی ہزاروں صفحے الٹ جائے مگر اس کی تدریجی رفتار کا اندازہ ملنا تو ایک طرف یہ بھی پتہ لگنا مشکل ہے کہ کس کس عہد میں اس کے باکمال موجدوں نے اس کی ایجادیں اور نئی امت نے اس کی اصلاحیں کیں اور کن کن قالبوں اور کن کن صورتوں سے یہ شاہد دل فریب بزم عالم میں جلوہ گر ہوا۔''

(کارنامہ عبرت،ص1)

پھر مصنف مرحوم نے قرطبہ، غرناطہ، مدینۃ الزہرا، اسپین، المیریا، جیروتا، دمشق وغیرہ کی علمی اور تجارتی ترقیوں کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ آخر میں ہندوستان کی قدیم صنعتوں کی ترقیوں کا اجمالی احوال لکھا ہے، اس کے بعد مصنف نے بغداد کی تجارتی وصنعتی ترقیوں کی تفصیل بیان کی ہے اور پھر عربوں کی تجارتی تفصیلات ہیں جن کے بارے میں عام رائے ہے کہ انھوں نے بڑی بڑی تجارتی منڈیاں بنائی تھیں۔

ایک منفرد موضوع ہونے کے باوجود مولانا محمد فضل رب عرشی تاجپوری نے نہایت محنت عمدگی سے داد تحقیق وتصنیف دی ہے۔ اس کتاب سے جو بات سب سے زیادہ واضح ہوکر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مولانا عرشی کی تاریخ بالخصوص تاریخ اسلام پر بڑی گہری نگاہ تھی اور ان میں تاریخی واقعات سے عبرت ونصیحت کا پہلو واضح کرنے اور اس کا مرقع کھینچنے کی بھی پوری پوری اہلیت اور صلاحیت تھی۔ اس کتاب کے ماخذ میں علامہ شبلی کی بھی بعض تصانیف شامل ہیں۔

■

Dr. Mohd Ilyas Al-Azmi
Darul Musannefin, Shibli Academy
Azamgarh- 276001 (UP)
Mob.:9838573645
azmi408@gmail.com

اُردو کا نندلال

شفیع ایوب

جو نیرنگ سرحدی بن کے چمکا

نند لال نیرنگ سرحدی اردو کے بڑے عاشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ بطور مدرس اور بطور شاعر پوری زندگی اردو کی خدمت میں گزار دی۔ لیکن اردو حلقے میں جو پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ انتقال کے بعد رفتہ رفتہ گمنامی کے اندھیروں میں کہیں کھو گئے تھے۔ بھلا ہو نیرنگ سرحدی کے بیٹے نریش نارنگ کا کہ انھوں نے ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی سے رابطہ کیا۔ کناڈا میں اردو زبان و ادب کے علم بردار ڈاکٹر سید تقی عابدی نے برسوں کی تحقیق کے بعد اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نندلال نیرنگ سرحدی کا تمام کلام یکجا کر کے تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل ضخیم کلیات شائع کر دی۔ اس طرح ایک بار پھر نندلال نیرنگ سرحدی کے کلام کے حوالے سے اہل نظر نے اپنی آرا کا اظہار کرنا شروع کیا۔ نندلال نیرنگ کی زندگی کئی نشیب و فراز سے گزری۔ لیکن زندگی کے ہر موڑ پر وہ اردو سے محبت کو اپنا مقصد حیات بنائے رکھا۔ لیکن ناقدین ادب نے نندلال نیرنگ کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ کلیات نیرنگ سرحدی 'تعمیر بقا' کے مرتب ڈاکٹر سید تقی عابدی ان لفظوں میں اپنی شکایت درج کرتے ہیں:

''وہ شاعر فطرت جس نے پانچ سو کے قریب غزلیں، نظمیں، قطعات، مثنویات اور رباعیات سے گلستانِ اُردو کو رنگین کر دیا، جس نے درجنوں آزادی اور آزادی خواہوں انسانیت اور وطن دوستی پر منظومات لکھے وہ کیوں گمنامی اور بے چارگی کی زندگی گزار کر چلا گیا۔ ہم متشاعروں کے کلام کے اشتہار کے انبار تو دیکھتے ہیں لیکن کیوں ایک فطری شاعر کے کلام کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں اور خود شاعر اس کے کلام کے چھپنے کی آرزو لے کر اس بیداد دنیا سے چلا گیا۔''

(تعمیر بقا، نیرنگ سرحدی، ص 10)

نند لال نیرنگ سرحدی 6 فروری 1912 کو غیر منقسم ہندوستان کے مندھرا، ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام سادھو رام اور دادا کا نام کالے رام تھا۔ ان کے دادا کالے رام میونسپل کمیٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں داروغہ چنگی تھے۔

ایسے پرگو اور استادانہ مہارت رکھنے والے شاعر کے بارے میں یہ جاننا بھی دلچسپ ہوگا کہ انھوں نے شاعری کا آغاز کب کیا؟ اس سلسلے میں 'میری شاعری' کے عنوان سے مارچ 1967 میں لکھا ہوا ان کا ایک مضمون موجود ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''میری شاعری کی ابتدا جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، میرے کرم فرما مولانا عطاء اللہ خان صاحب کی زیر نگرانی ہوئی۔ وہ خود ایک بہت بڑے عالم اور اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر تھے، اسی زمانے میں جناب منشی تلوک چند صاحب محروم سے ملاقات ہوئی جو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک مقامی اسکول میں نائب مدرس ہو کر تشریف لائے تھے۔ ان کی خدمت میں رجوع کیا۔ انھوں نے بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی اور چند سادہ باتیں جو بنیاد شاعری کے لیے ضروری تھیں میرے ذہن نشیں کرائیں اور مجھے باقاعدہ لکھنے کے لیے ہدایت فرمائی۔'' (تعمیر بقا، ص 154)

نندلال نیرنگ سرحدی پیشے سے معلم تھے۔ تمام زندگی تنگ دستی میں گزاری۔ اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ شعر و ادب کو اپنی زندگی میں سب سے عزیز رکھا۔ اردو اور ہندی کے علاوہ پشتو، فارسی، سنسکرت وغیرہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اردو تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ لوگ انھیں اردو تہذیب کا نقیب کہتے تھے۔ سفید پاجامہ اور کالی شیروانی پسندیدہ لباس تھا۔ سر پر اکثر شنیل کی ٹوپی ہوتی اور ہاتھ میں کشمیری چھڑی۔ بڑے محنتی اور جفاکش تھے۔ صبح جلدی سو کر اٹھ جاتے تھے اور عام طور پر رات بارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ مطالعے کے شوقین تھے۔ مشاعروں میں خوب شرکت فرماتے لیکن کبھی کسی سے عرض تمنا نہیں کرتے۔ خود بھی مشاعرے منعقد کرتے جس میں ملک کے ممتاز شعرائے کرام شرکت فرماتے تھے۔

نند لال نیرنگ سرحدی کلاسیکی شعرا کے کلام کا خوب مطالعہ کرتے تھے۔ وہ اس بات کی اہمیت سے واقف تھے کہ میر، سودا، درد، انیس، غالب، مومن، ذوق، داغ، اقبال وغیرہ کا مطالعہ کسی بھی شاعر کے لیے ناگزیر ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شعرا کے کلام پر تضمین بھی کی ہے۔ تضمین نگاری آسان نہیں ہے۔ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہی تضمین نگاری کے فن سے انصاف کر سکتا ہے۔ نیرنگ سرحدی نے خواجہ میر درد کی مشہور غزل کے تین شعروں پر مخمس میں تضمین کی اور اس تضمین کا نام 'نغمۂ توحید' رکھا۔ انھوں نے مرزا غالب کے اشعار پر بھی تضمین کی ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کامیاب تضمین نگار تھے۔ تعمیر بقا کے مرتب ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں:

''تضمین وہ شعر یا نظم ہے جس میں شاعر کسی شاعر کے مصرعے یا شعر پر اپنے مصرعے جوڑ دیتا ہے۔ نیرنگ نے اساتذہ میں خواجہ میر درد اور مرزا غالب کی غزل کے چند منتخب شعروں پر تضمین باندھی ہے۔ انھوں نے بسمل سعیدی کی غزل کے شعر پر دو مصرعے اضافہ کر کے قطعہ بنا دیا۔

جس سے نہ بجھے تشنگی اے حضرت نیرنگ
اس ساغر مئے کو کبھی ساغر نہیں کہتے
کعبہ میں مسلماں کو بھی کہہ دیتے ہیں کافر
بُت خانہ میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے

(تعمیر بقا، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص253)

نیرنگ سرحدی غالب کے بڑے عاشق تھے۔ ان کے بیٹے نریش نارنگ نے اپنے کئی انٹرویوز میں بتایا ہے کہ نیرنگ صاحب ہمیشہ غالب کے دیوان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں غالب کی بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی۔ غالب کی چھوٹی بحر کی ایک مشہور غزل کے چھے اشعار پر مخمس کی ہیئت میں تضمین کیا ہے۔ مطلع کا بند دیکھیے۔

جوشِ شباب میں اسے سرشار دیکھ کر
ذرے میں ایک حسن کا انبار دیکھ کر
پیشِ نگاہ مطلعِ انوار دیکھ کر
کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

نیرنگ سرحدی کے شعری سرمائے میں نظموں، غزلوں، قطعات وغیرہ کے ساتھ حمد، نعت، منقبت بھی کچھ ہے۔ مناجات کے اشعار دیکھیں تو نہ صرف نیرنگ سرحدی کی قادر الکلامی عیاں ہوتی ہے بلکہ ان کا صوفیانہ مزاج بھی سامنے آتا ہے۔ نیرنگ سرحدی ایک طرف بھگتی تحریک سے متاثر تھے تو دوسری طرف مولانا روم کی مثنوی کو اپنے دل کے قریب پاتے تھے۔ انھوں نے جو مناجات لکھی ہے اس میں خالق کائنات کی حمد، وحدت کے حوالے سے اس کی عظمت کے ذکر کے ساتھ ساتھ مخلوقات اور کائنات پر اس کے اختیار اور اقتدار کا ذکر بھی ہے۔ مسدس کی شکل میں آٹھ بند کی ایک نہایت پُر اثر اور درد انگیز مناجات ان کے مجموعے میں شامل ہے۔ بطور نمونہ صرف ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

درد مندوں کی دوا، اور شفا کے مالک
خالق ہر دو جہاں، ارض و سماء کے مالک
صاحب فقر و غنا، شاہ و گدا کے مالک
واقف راز فنا، دار بقا کے مالک
ہیں گل و خار ترے، سرو سمن تیرے ہیں
خشک و تر تیرے ہیں صحرا و چمن تیرے ہیں

سہل ممتنع میں شعر کہنا بھی قیامت ہے۔ نیرنگ سرحدی چونکہ ایک استاد شاعر تھے، اس لیے ان کے کلام میں ہر رنگ کے اشعار موجود ہیں۔

نندلال نیرنگ سرحدی پیشے سے معلم تھے۔ تمام زندگی تنگ دستی میں گزاری۔ اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ شعر و ادب کو اپنی زندگی میں سب سے عزیز رکھا۔ اردو اور ہندی کے علاوہ پشتو، فارسی، سنسکرت وغیرہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اردو تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ لوگ انھیں اردو تہذیب کا نقیب کہتے تھے۔

تذکروں کی ایک اصطلاح ہے سہل ممتنع۔ عہد ساز شاعر حسرت موہانی نے لکھا تھا کہ ''سہل ممتنع سادگی حسن و بیان کی اس صفت کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات مرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا شاعر کے لیے آسان ہے مگر جب خود کوشش کرے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔'' کسی شاعر کے کلام میں سہل ممتنع کے اشعار کا پایا جانا بھی اس کی ایک بڑی خوبی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر رحمتی لکھتے ہیں:

'' اصطلاح میں سہل ممتنع ایسے کلام کو کہتے ہیں جس میں نازک، بلند اور دقیق خیال کو بھی آسان، سلیس اور مانوس الفاظ میں اس قدر سادگی اور صفائی کے ساتھ باندھا جائے کہ وہ خیال و شعر عام و معمولی لگنے لگے یعنی قاری اور سامع کو مفہوم کی ترسیل اس طرح ہو جائے جیسے ایک عام بات کی ترسیل ہو جاتی ہے۔ سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ ایسا شعر جس کی نثر نہ کی جا سکے یعنی اس میں اتنی سادگی و عمومیت ہو کہ نثر میں کچھ بیان کرنے کے لیے باقی ہی نہ رہے، سہل ممتنع کا شعر کہلاتا ہے۔''

(ظہیر رحمتی، غزل کی تنقیدی اصطلاحات، ص327)

بطور نمونہ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

محبت میں جفا ہوتی رہی ہے
نہ جانے کیا خطا ہوتی رہی ہے
کسے معلوم میرے دل کی حالت
تری محفل میں کیا ہوتی رہی ہے
ہمیشہ بزم میں واعظ کے ہوتے
پراگندہ فضا ہوتی رہی ہے
جہاں پڑھنے گئے نیرنگ وہاں پر
غزل پر واہ وا ہوتی رہی ہے

نیرنگ سرحدی بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اور اخلاقی قدروں پر زور دیتے تھے۔ وہ حضرت انسان کی عظمت کو پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر کا شاعر کئی مرتبہ معلمِ اخلاق بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ خصوصی طور پر انھوں نے اپنے قطعات میں اخلاقی درس دیا ہے۔ کلام نیرنگ سرحدی کے مرتب، ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق نیرنگ سرحدی کے قطعات کی تعداد تقریباً ایک سو اسّی (180) ہے۔ نیرنگ نے کچھ قطعات فارسی میں بھی لکھے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ یہ انسان یعنی حیوانِ ناطق اگر اخلاق اور کردار کی دولت سے مالا مال ہے تبھی اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہے۔

خود غرضی اور احسان فراموشی بھی ہماری اخلاقی گراوٹ کے سبب معاشرے میں موجود ہے۔ یہاں بیشتر احباب چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ ہم جذبۂ احترام کے ساتھ کسی کو سلام کرنے والے بنیں۔ اس بات کو نیرنگ سرحدی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس قطعہ میں پیش کیا ہے۔

کوئی جھک کر سلام کرتا ہے
ظاہراً احترام کرتا ہے

ظاہراً احترام کرتا ہے
بے غرض آج کل زمانے میں
کون کس کو سلام کرتا ہے

نیرنگ سرحدی کا ماننا تھا کہ شاعر کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہوتا ہے۔ وہ خود ایک نیک دھارمک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ سبھی مذاہب کا احترام کرتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے یہی پیغام دینے کی کوشش کرتے رہے کہ انسانیت کو سب سے بڑا مذہب تصور کیا جائے۔ انھوں نے ہر مذہب کے تہواروں کے حوالے سے نظمیں لکھیں۔ ہر مذہب کے مذہبی رہنماؤں کو اپنی شاعری کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے گرو نانک صاحب، گرو گوبند سنگھ، مہاویر سوامی اور مہرشی دیانند کے بارے میں جس عقیدت سے نظمیں لکھی ہیں اُس سے نیرنگ سرحدی کی رواداری اور وسعتِ قلب کا ثبوت ملتا ہے۔ عید کے موقعے پر غزل کی ہیئت میں جو نظم انھوں نے لکھی تھی اسے بڑی عقیدت سے سنایا کرتے تھے۔ چند اشعار دیکھیں۔

نگاہِ لطف و کرم ہو تو عید ہوتی ہے
نصیب دولتِ غم ہو تو عید ہوتی ہے
عُروجِ عشق یہی ہے تمہارے نام کے ساتھ
ہمارا نام رقم ہو تو عید ہوتی ہے
جبینِ شوق نے سجدے کہاں کہاں نہ کیے
تمہارے در پہ جو خم ہو تو عید ہوتی ہے
نشاطِ شعر و سخن میں یہی تو ہے نیرنگ
زباں ہو، زورِ قلم ہو تو عید ہوتی ہے

مشرق و مغرب کی جو کشاکش ہمیں علامہ اقبال کی شاعری میں ملتی ہے، اس کا پرَتو نیرنگ سرحدی کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ جس طرح علامہ اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں نہ مشرق سے بیزار ہونا ہے نہ مغرب کی اندھی تقلید کرنی ہے۔ بلکہ یہ یاد دلایا کہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کیا جائے۔ علامہ اقبال کی اس فکر کو نیرنگ سرحدی نے بھی اپنی شاعری میں برتا ہے۔ بے شک وہ مشرق کے دلدادہ ہیں لیکن مغرب کی ترقی سے مشرق کو سنوارنا بھی چاہتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے ''کسی دوست کی امریکہ سے واپسی پر''۔ مسدس کی شکل میں چھ بند پر مشتمل نظم میں ایک مثبت پیغام ہے۔ اس نظم میں امریکہ کی مادی ترقی کا ذکر بھی ہے اور اپنے وطن کی خوبصورتی اور قدرتی وسائل کا بیان بھی ہے۔

نیرنگ سرحدی ایک طرف بھگتی تحریک سے متاثر تھے تو دوسری طرف مولانا روم کی مثنوی کو اپنے دل کے قریب پاتے تھے۔ انھوں نے جو مناجات لکھی ہے اس میں خالق کائنات کی حمد، وحدت کے حوالے سے اس کی عظمت کے ذکر کے ساتھ ساتھ مخلوقات اور کائنات پر اس کے اختیار اور اقتدار کا ذکر بھی ہے۔

چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ملک امریکہ سے آنا ہو مبارک نوجواں
تیری اس توقیر پر شاداں ہے ہر خورد و کلاں
سیر کی ہے تو نے امریکہ کے ارضِ پاک کی
تو نے دیکھی ہے زمیں واشنگٹن، نیو یارک کی
لوگ کہتے ہیں نرالی ہے وہاں کی سرزمیں
کوہ دریا کے مناظر ہیں وہاں سحر آفریں
کیا کوئی دریا وہاں پر ہمسرِ جمنا بھی ہے
کیا ہمالہ کی بلندی ہے وہاں گنگا بھی ہے
تاج کی صورت عمارت کوئی دیکھی ہے وہاں
ہے زمینِ ہند پر جو یادگارِ شہہ جہاں
کیا وہاں بھی دفن ہے کوئی محبت کا نشاں
جس کے آگے سر جھکاتے ہوں زمین و آسماں
تُو نے امریکہ کے علم و فن سے پائی آگہی
تجھ کو بھارت میں نظر آئے اگر کوئی کمی
منتشر کر دے وہاں علم و ہنر کی روشنی
روشنی میں ہو اضافہ تا کہ تیری ذات سے
پار بیڑا ہند کا ہو قلزمِ ظلمات سے

ایسی بہت سی عمدہ نظمیں نیرنگ سرحدی کے یہاں ملتی ہیں جن میں وطن سے محبت کا پیغام دیا گیا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں شانِ وطن اور عزمِ جوانانِ وطن کے گیت گاتے ہیں۔ وہ وطن سے محبت کا درس دیتے ہیں اور اہنسا کا پاٹھ پڑھاتے ہیں۔

چند نامساعد حالات کے سبب نیرنگ سرحدی کا کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اس بات کا انھیں قلق تھا۔ لیکن وہ اپنے کلام کی اشاعت کے لیے کسی کے سامنے اظہار تمنا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک خوددار اور قناعت پسند شاعر کے لیے یہ بہت مشکل کام تھا۔ اہلِ جہاں نے اس کرب کو محسوس نہیں کیا اور وہ خود اپنی زباں سے اظہار نہ کر سکے لیکن اپنے کئی اشعار میں انھوں نے اس کرب، بے چینی اور تڑپ کو بیان کیا ہے۔ انھیں اس بات کی فکر ضرور تھی کہ ان کے بعد ان کے کلام کا کیا حشر ہوگا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شاعری ان کی زندگی ہے۔ شاعری کے بغیر وہ ادھورے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

نیرنگ! شاعری تھا مرا مقصدِ حیات
معلوم کیا ہو حال مرا شاعری کے بعد

ایک مدت تک مصائب، آلام، تنگ دستی اور تنگ حالی کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد نند لال نیرنگ سرحدی کو شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ اب سامانِ سفر باندھنے کا وقت ہو چلا ہے۔ آخری وقت میں بھی یاس اور مایوسی سے اپنا دامن بچاتے ہیں لیکن حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اَب نہ پہلی سی شان باقی ہے
ہے غنیمت کہ جان باقی ہے
سب بلائیں تو دیکھ لیں نیرنگ
موت کا امتحان باقی ہے

5 فروری 1973 شام کے سات (7) بجے، حرکت قلب بند ہو جانے سے نیرنگ سرحدی کا انتقال ہوا۔

■

Dr. Shafi Ayyub (Shafi Uzzama Khan)
Centre of Indian Languages,
SLL&CS / JNU
New Delhi. - 110067
Mobile: 8860248513
shafiayub75@rediffmail.com

فیضان حیدر

جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی اور ان کی غزلیہ شاعری

جہان رنگ و بو میں کچھ ہستیاں ایسی بھی عالم وجود میں آئیں جو اپنی بصیرت، تخلیقی فکر اور ادبی خدمات سے نہ صرف معاشرے کی فکری رہنمائی کرتی رہیں بلکہ ادبی دنیا کو بھی نیا رنگ و آہنگ بخشتی رہیں۔ جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی انھیں روشن ستاروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی علمی و ادبی خدمات سے نہ صرف ادبی دنیا کو تابانی بخشی بلکہ اسے ایک نئی سمت سے روشناس بھی کرایا۔ راز کرہلوی ایک منفرد اور حساس شاعر ہونے کے ساتھ ایک رسالے کے مدیر بھی رہے۔ ان کے زیر ادارت شائع ہونے والے رسالے 'سلگتی لکیریں' نے نئے لکھاریوں کو ایک مستند پلیٹ فارم فراہم کیا، جب کہ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے معیاری تحریریں بھی پیش کیں۔ ان کی شاعری عشق و محبت، ناکامی و نامرادی، مایوسی و محرومی اور انسانی جذبات و احساسات کے اظہار سے عبارت ہے۔ وہ ان شعرا میں ہیں جو رسم و راہِ عام کے پابند نہیں بلکہ جداگانہ اندازِ نظر کے حامل اور ایک خاص طرز کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے فکر و فن کو نئی جہتوں اور نئی سمتوں سے آشنا کیا۔

جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی 6 نومبر 1922 کو ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دیا شنکر شمیم (1954-1895) خود اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان 'موج شمیم' کے نام سے 1974 میں شائع ہو چکا ہے۔ راز کرہلوی کی ابتدائی تعلیم کرہل اور مین پوری میں ہوئی۔ کے۔ پی کالج الٰہ آباد سے انٹر اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی کام تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے ایم کام اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد کے۔ پی کالج الٰہ آباد میں لکچرر مقرر ہو گئے۔ چار سال کے بعد 1949 میں سیلس ٹیکس افسر مقرر ہو گئے اس لیے لکچرر کی ملازمت ترک کر دی۔ منظور ہاشمی ان کی شخصیت کا مکمل خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''کھلتا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں سے مسکراہٹ کے برستے ہوئے پھول، چہرے سے خلوص اور شرافت کی پھوٹتی ہوئی کرنیں، برتاؤ میں بے پناہ اپنائیت، گفتگو میں ایسی نرمی اور گھلاوٹ کہ جو ایک بار ملے ان کا ہو کر رہ جائے، اخلاق و محبت کا پیکر، یہ ہیں جناب جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی۔ جہاں رہے جان انجمن بن کر رہے۔ جس جگہ گئے شعر و ادب کے چراغ کو روشن رکھا۔''

(راز و نیاز، جگدیش سرن سکسینہ راز کرہلوی، ناظم پریس، رامپور، 1976، پشت کی تحریر)

شاعری کے ساتھ 'سلگتی لکیریں' کے اداریے بھی ان کی ذہانت اور سیاست پر گہری نظر کے غماز ہیں۔ زبان و بیان میں ایک انقلابی رنگ نمایاں ہے جو قارئین کے جذبۂ حب الوطنی اور فرض شناسی کو نہ صرف متحرک کرتا ہے بلکہ قومی یکجہتی کا پیغام بھی دیتا ہے اور ان کے دلوں میں جوش و جذبہ اور ایثار و قربانی کے تئیں ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عالمی سطح کے موضوعات اور مدعوں پر بھی کھل کر لکھا۔ ملک و قوم اور عالمی مسائل پر ان کی تحریریں قابل ذکر ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ ان کی نظر محدود نہیں ہے۔ شاعری میں ان کا اسلوب اپنے عہد کے شعرا سے قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور فرہنگ و ثقافت کا بہترین ڈھنگ سے احاطہ کیا ہے جو انھیں قوم پرست شاعر کی حیثیت سے بھی روشناس کراتا ہے۔ ان کے دو مجموعے 'راز و نیاز' اور 'سوز و گداز' اردو اور دیوناگری رسم الخط میں منظر عام پر آئے۔ بعد میں دونوں مجموعوں کے انتخابات بھی شائع ہوئے۔

راز کرہلوی کے جذبات و احساسات محدود نہیں تھے۔ وہ کسی بھی چیز پر رسمی ردعمل ظاہر نہیں کرتے بلکہ اس کے اسرار و رموز تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظر ان کے ہم حلقہ شعرا سے زیادہ گہری، زیادہ محیط، زیادہ جامع، زیادہ وسیع اور زیادہ حقیقت بیں ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ افکار، گہرے جذبوں اور معنی خیز تجربوں سے ہمیں زندگی کی صداقتوں کا بھرپور احساس دلاتے ہیں جو ہم کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا داعی بنتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام 'راز و نیاز' کے تعارف میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاکر بھارتی رقم طراز ہیں:

''جناب راز نے ایک انتہائی ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ایک طرف گھر پر والد اور ان کے نانا جناب مکٹ بہاری لال کی اردو اور فارسی کی شاعری کا سایہ تھا، دوسری طرف کرہل میں ماہانہ طرحی مشاعروں کی فضائیں، اور مین پوری میں جناب جگر، ناتک، رنگیلے، مائل وغیرہ مایہ ناز شاعروں کے نغموں سے گونجتی محفلیں تھیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر شاعری کا جوہر ان کی فطرت میں بچپن سے موجود تھا۔ چوتھی جماعت میں پہنچتے پہنچتے کھلاڑی تخلص رکھ کر باقاعدہ ایک طرحی مشاعرے میں

اعلان کیا کہ

کھلاڑی ہیں تخلص بھی رکھا ہم نے کھلاڑی کا
پڑھا کرتے ہیں درجہ چار میں کربل میں رہتے ہیں
(ایضاً،ص د)

وقت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی جذبہ پروان چڑھتا رہا۔ جلد ہی مزاج میں شائستگی اور متانت پیدا ہوگئی چنانچہ کھلاڑی سے راز تخلص اپنایا۔ راز کی ادبی زندگی اب راز نہ رہ سکی اور علمی و ادبی ذوق وشوق ان کو علمی و ادبی نشستوں اور مشاعروں کی طرف کھینچ لایا۔ جہاں بھی رہے شمع انجمن بن کر رہے۔ طرحی و غیر طرحی مشاعروں میں مترنم لہجے میں غزلیں سناتے اور اپنی دل کش آواز سے سامعین پر ایک سماں باندھ دیتے۔ انھوں نے اپنے کلام پر باقاعدہ طور پر کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ والد کی صحبت اور ادبی و شاعرانہ ماحول نے انھیں فارغ الاصلاح بنا دیا۔ دلکش آفریدی ان کے مجموعہ کلام 'راز و نیاز' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راز صاحب کی ہمہ رنگ و ہمہ صفات شخصیت اوران کا فن ادبی دنیا میں قبولیت کی سند رکھتا ہے۔ یوں تو جملہ اصناف سخن میں کہتے ہیں مگر غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے۔ ان کی زبان گنگ وجمن کے مقدس پانی میں ڈھلی ہوئی پاکیزہ ولطیف ہے۔'' (ایضاً،ص د)

ان کی شاعری عشق ومحبت، ناکامی ونامرادی، مایوسی ومحرومی اور انسانی جذبات واحساسات کے اظہار سے عبارت ہے۔ وہ ان شعرا میں ہیں جو رسم وراہِ عام کے پابند نہیں بلکہ جداگانہ اندازِ نظر کے حامل اور ایک خاص طرز کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے فکروفن کو نئی جہتوں اور نئی سمتوں سے آشنا کیا۔

ان کی غزلوں کے مطالعے سے دلکش آفریدی کی رائے حرف بہ حرف درست ثابت ہوتی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں عشق ومحبت اور درد کے جذبات کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق، غم، وفا اور حسن جیسے موضوعات کا دل کش انداز میں احاطہ کیا ہے۔ ساتھ ہی وفاداری، مایوسی اور انسانی جذبات واحساسات کے تضادات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ الفاظ کی چاشنی اور خیال کی پہنائی قابل ذکر ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی قابل داد ہے جس کی وجہ سے قاری یا سامع کو اشعار کے معانی سمجھنے اور محسوس کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ ایک غزل کے چند اشعار کی قرأت کیجیے

درد بڑھ کر دوا نہ ہو جائے
ایک مشکل سوا نہ ہو جائے
ان کا وعدہ وفا نہ ہو یا رب
دشمنوں کو گلہ نہ ہو جائے
دیکھ محفل سے ہم چلے محروم
اب کسی پر جفا نہ ہو جائے
نامرادی عشق کا غم کیا
حسن بے آسرا نہ ہو جائے
دل میں ہے درد، درد میں دل ہے
درد دل سے جدا نہ ہو جائے

مذکورہ غزلیہ اشعار اسلوب کی لطافت، فکر کی گہرائی اور اظہار کی لطافت کے باعث نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر شعر منفرد موضوع کو اجاگر کرتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ اشعار ایک مربوط جذباتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ان میں محاوراتی زبان کی چاشنی موجود ہے، جیسے 'درد بڑھ کر دوا نہ ہو جائے' اور 'دیکھ محفل سے ہم چلے محروم'۔ اس میں تراکیب اور تشبیہات کا خوب صورت استعمال بھی کیا گیا ہے، جیسے 'حسن بے آسرا نہ ہو جائے' اور 'درد دل سے جدا نہ ہو جائے'۔ یہ اشعار جذبات واحساسات کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ خیالات اور جذبات عمومی مسائل اور کیفیات پر مبنی ہیں، جنھیں ہر دور اور ہر معاشرہ سمجھ سکتا ہے۔ عشق، مایوسی اور انسانی تعلقات کے پہلو آفاقی نوعیت کے ہیں۔ ساتھ ہی بحر وقوافی کا استعمال نہایت متوازن ہے۔ اشعار کی روانی اور ہم آہنگی ان کے عروضی حسن کی عکاسی کرتی ہے۔

حسن، شوخی، لطافت، شیرینی، رنگینی اور طرح داری نے ان کی غزلیہ شاعری کو ایک منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کی قوت تخیل نے روز مرہ اور محاورات کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے جس سے ان کے اشعار میں تہ داری اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

تو حسن کا پیکر ہے آنکھیں تری مستانہ
بت خانے کا بت خانہ، میخانے کا میخانہ
مارا ہوا الفت کا جائے تو کہاں جائے
اے شمع جلا ڈالا تو نے پر پروانہ
معراج محبت میں ہر چیز نئی دیکھی
ہر کیف ترا یکتا ہر درد جداگانہ
دل دے کے انھیں میں نے یہ درد جگر پایا
کچھ دے دیا نذرانہ کچھ لے لیا نذرانہ
گرمی محبت ہے، اشکوں کی نمی بھی ہے
پلکوں میں سجایا ہے تیرے لیے خشخانہ
بجلی کی چمک دیکھی صیاد کے تیور بھی
کیا کیا نہیں ہم جھیلے اے چرخ اسیرانہ

یہ اشعار محبت، درد و کرب اور قربانی جیسے موضوعات پیش کرتے ہیں۔ تشبیہات واستعارات کا عمدہ استعمال، جذبات کی گہرائی اور تخیل کی پرواز قابل ملاحظہ ہے۔ راز نے کلاسیکی شعری روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں جدت و انفرادیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ عاشق کے جذبات و کیفیات کو نہایت خوب صورتی اور دل کشی سے بیان کیا ہے، جیسے 'پروانے کی قربانی' اور 'اشکوں کی نمی' وغیرہ۔ اسی طرح بت خانہ، میخانہ اور خشخانہ جیسے الفاظ کے ذریعے محبت اور حسن کی مختلف کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ پروانہ اور شمع کا استعارہ کلاسیکی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے، جو یہاں بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔

راز کی شاعری ان کے جذبات و احساسات کا بے محابا اظہار ہے۔ جس چیز کا انھیں دل سے احساس ہوتا ہے وہی بات بے ساختہ زبان پر آ جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنے جذبات واحساسات کا بیان نہایت مہذب اور متین انداز میں کرتے ہیں جو ان کے تربیت یافتہ ذوق کا آئینہ دار ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

حسن، شوخی، لطافت، شیرینی، رنگینی اور طرح داری نے ان کی غزلیہ شاعری کو ایک منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کی قوت تخیل نے روزمرہ اور محاورات کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے جس سے ان کے اشعار میں تہ داری اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔

گلگونہ عارض کے تحفظ میں خمیدہ
خنجر ہیں یہ دو ابروئے خمدار نہیں ہیں
بکھرے ہوئے شانوں پہ یہ لہرائے ہوئے سے
ہیں مارِ سیہ گیسوئے دلدار نہیں ہیں
کاکل کے خم و پیچ سے ہوتا ہے گماں یہ
شعلے تو کہیں برسر رخسار نہیں ہیں
ساقی ہمیں کچھ مست نگاہوں سے عطا ہو
مے خانے میں ہم مے کے طلبگار نہیں ہیں

ان اشعار میں شاعر نے محبوب کے ابرو، زلفیں، عارض اور نگاہوں کو تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کیا ہے۔ ہر مصرعے میں حسن کی جاذبیت اور عشق کی لطیف کیفیت نمایاں ہے۔ یہ اشعار محبوب کے حسن، اس کی کشش اور عاشق کی محبت کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر نے ابروؤں کو خنجر، زلفوں کو مارِ سیہ اور کاکل کے خم کو شعلے سے تشبیہ دی ہے، جو محبوب کے حسن کی جان لیوا جاذبیت کے عکاس ہیں۔ آخر میں عاشق کا اصرار ہے کہ وہ محبوب کی مست نگاہوں کو حقیقی شراب سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔

اردو کے تقریباً تمام شعرا نے غم عشق اور غم دوراں کی شکایت کی ہے، لیکن راز کا انداز کچھ نرالا ہے۔

کر چکے یہ زندگی وقف سبو
پارسائی سے ہمیں کیا کام ہے
اے غم دوراں تو اپنی راہ لگ
اپنے ہاتھوں میں صراحی جام ہے

یہ اشعار کلاسیکی اردو شاعری کی اس روایت کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں عیش و طرب، درویشی اور غم دوراں کے درمیان ایک انوکھا تضاد پیش کیا جاتا ہے۔ مذکورہ اشعار میں ایک طرح کی بے نیازی، زندگی سے فرار اور صوفیانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ شاعر دنیا کے غموں اور مشکلات کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک الگ راہ منکشف کرتا ہے، جہاں غموں کو مے نوشی اور بے فکری سے زائل کر سکے۔ یہ انداز اردو شاعری میں میر، غالب اور دیگر کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے، جہاں دنیا کے غم و اندوہ اور انسانی بے بسی کے خلاف ایک احتجاج عیش و طرب کی صورت میں نظر آتا ہے۔

ان کے صوفیانہ اشعار کے مضامین تقریباً وہی ہیں جو ان کے پیش رو شعرا کے ہیں، لیکن ان کی فنی ہنرمندی، رچاؤ اور حسنِ ادا ملاحظہ ہو۔

اے راز دمِ آخر جی بھر کے پلا دینا
ساقی مئے وحدت سے لبریز ہو پیمانہ

یہ شعر صوفیانہ شاعری کی معراج ہے جہاں شاعر نے وحدت یعنی 'وحدت الوجود' کے فلسفے کو نہایت لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے۔ 'دمِ آخر' زندگی کے آخری لمحے کو بیان کر رہا ہے، جب انسان حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔ 'جی بھر کے پلا دینا' عرفانِ حقیقت و معرفت کی طلب ہے، یعنی شاعر خدا سے التجا کر رہا ہے کہ آخری گھڑی میں معرفتِ حق کا جام نصیب ہو۔ صوفیانہ شاعری میں 'پیمانہ' اکثر محبتِ الٰہی یا معرفتِ حق کا استعارہ ہے۔ یہاں شاعر وحدت (یعنی حق) سے بھرپور عرفانی کیفیت

کی آرزو کر رہا ہے۔ یہ ایک مکمل صوفیانہ تصور ہے، جس میں فنافی اللہ اور حق کے ساتھ اتحاد کی خواہش نظر آتی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری زمینی حقیقتوں کی ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ایک عام انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ مختلف اوقات میں انسان پر گوناگوں قسم کے جذبات طاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات کو مختلف زاویے سے غزلوں میں سمویا ہے۔ اردو کی عام روایات کو اپنی شاعری میں ضرور برتا ہے لیکن تجربات و مشاہدات کو غزلیہ شاعری کا محور و مرکز قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ انسان کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے جس کو سمجھنا آسان نہیں۔ خصوصاً محبوب کے رویے کو سمجھنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جہاں کہیں انھوں نے اپنے محبوب کے ظاہر پر توجہ مرکوز کی ہے وہیں اس کے باطن میں جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کا معشوق آج کی صارفیت زدہ زندگی کا فرد ہے، چنانچہ اس کا سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔ ایک لمحے میں وہ جذبات کے جس پڑاؤ پر ہوتا ہے پل بھر میں وہ سطح پورے طور پر تبدیل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عاشق کا اندرون بھی انتشاری کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن وہ معشوق کی پینترے بازی کو ناز و ادا سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان کی غزلیہ شاعری روایت و جدت سے ہم آہنگ ہے۔ وہ روایت کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں لیکن روایتی الفاظ و تراکیب کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں معانی کی وسعت، تشبیہات و استعارات اور علامتوں کا عمدہ استعمال ملتا ہے۔ کہیں کہیں جذبات و احساسات کی رو میں بہہ کر ابتذال اور سوقیت کا بھی شکار ہو جاتے ہیں جس کا شکار کم و بیش ان کے بھی ہمعصر شعرا ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ وہ جس سماج اور معاشرے سے تعلق رکھتے تھے ان کی شاعری اس کی بہترین آئینہ دار ہے۔

■

Dr. Faizan Haider
Assistant Professor Dept. of
Urdu & Persian, C.M. College,
Quila Ghat, Darbhanga - 846004
Mob.: 7388886628,
E-mail: faizanhaider40@gmail.com

رفعت سروش: جن کی آواز ریڈیو کی شناخت بن گئی تھی

ایم اے کنول جعفری

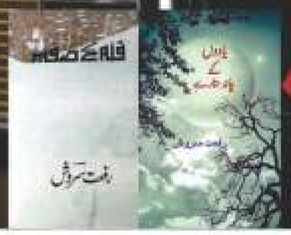

اتر پردیش کے مغرب میں گنگا کے کنارے آباد ضلع بجنور میں نجیب آباد، بجنور، نگینہ، چاند پور، دھام پور، شیرکوٹ، سیوہارہ، افضل گڑھ، منڈاور اور کرت پور جیسی کئی اہم بستیاں ہیں۔ یہ بستیاں نہ صرف اپنی قدیم طرز، تاریخ، تعلیم اور سیاسی اعتبار سے اہم ہیں، بلکہ انھیں ادب کی دولت سے مالا مال ہونے کی سعادت بھی نصیب ہے۔ سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمان بجنوری، ڈپٹی نذیر احمد، تاجور نجیب آبادی اور اختر الایمان سمیت اردو ادب کے کئی سپوتوں کا تعلق اسی ضلع سے ہے۔ اسی ضلع کی ادب نواز بستیوں میں ایک بستی کا نام ہے نگینہ۔ ادب پارے کی اس مردم خیز بستی کو اردو ادب کی نثری اور شعری دونوں اصناف کی قابل قدر خدمات سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس ادب گاہ سے ایک ایسے شخص کا گہرا تعلق رہا ہے، جس کی حیثیت اردو ادب کے دائرہ کار (انگوٹھی) میں دمکتے نگینے کی طرح اہم اور نمایاں ہے۔ اپنے انفرادی لب و لہجے اور جداگانہ مزاج کے اس کردار کو خداداد صلاحیت اور خصوصیات کی بنا پر ادبی دنیا میں صدیوں تک یاد کیا جائے گا۔ اس منفرد ادیب، معروف شاعر، منظوم ڈرامہ نگار، بہترین انشاپرداز، دم دار مترجم، بے مثل نثر نگار اور اعلیٰ براڈ کاسٹر جیسی خوبیوں کی شخصیت کا اصل نام شوکت علی ہے۔ وہی شوکت علی، جسے ادبی حلقوں میں رفعت سروش کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ یوں بھی جن شوقین افراد کو ریڈیو کا ارتقائی زمانہ یاد ہے، ان کے لیے یہ نام نیا نہیں ہے۔ ایک اچھے براڈ کاسٹر کے طور پر ان کی یاد یقینی طور پر ذہان میں محفوظ رہے گی۔ انھوں نے چار دہائی تک ریڈیو کے شائقین لوگوں کو ان کی ضیافت طبع کا پسندیدہ مواد فراہم کرانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ 'آل انڈیا ریڈیو' کے اپنے دور کے مشہور پروگرام 'اردو مجلس' کے تعلق سے ان کی آواز ریڈیو کی شناخت بن گئی تھی۔

شوکت علی کی پیدائش 02 جنوری 1926 کو نگینہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید محمد علی اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ ان کے دادا سید علی کا شمار نگینہ کے مخصوص لوگوں میں ہوتا تھا۔ رفعت سروش کی ابتدائی تعلیم نگینہ کے ایک مکتب میں ہوئی۔ مدرسے میں درجہ تین تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ میرٹھ ضلع کی تحصیل موانہ چلے گئے۔ 1935 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر بمبئی چلے گئے۔ 1949 میں ممبئی سے ہندی ودیا پیٹھ کے بھاشا رتن کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شروع سے ہی وظائف ملنے لگے تھے، اس لیے آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بڑے بھائی سید ممتاز علی نے رفعت سروش کی تربیت اور ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بھائی کی سرپرستی میں رہ کر نہ صرف خوش خط میں لکھنا سیکھا، بلکہ ادبی صفحات پر نثر اور نظم کو پڑھنے اور سمجھنے کی باریکیاں بھی سیکھیں۔ مصوری میں ان کی مہارت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ پیمانے کا استعمال کیے بغیر سامنے رکھی ہوئی چیز کی ہو بہو کئی گنا بڑی تصویر بنا لیتے تھے۔

رفعت سروش بنیادی طور پر شاعر تھے۔ انھوں نے میٹرک کے دوران ہی جدید طرز پر نظمیں لکھنی شروع کردیں، جو 'ہمایوں' اور 'شاہکار' جیسے جرائد میں متواتر شائع ہونے لگیں۔ انھیں ادبی دنیا میں شوکت نام پسند نہیں تھا۔ اس لیے دو لفظی قلمی نام 'رفعت سروش' سے لکھنا شروع کردیا۔ اس نام سے ان کی پہلی نظم 'گلاب کا پھول' شائع ہوئی۔

کھلا ہوا ہے جھاڑیوں میں پھول اک گلاب کا
اٹے ہوئے غبار میں ہیں جس کے عارض وجبیں
چچوکے دے رہے ہیں خار خنجروں سے پے بہ پے
لہو لہان ہے تمام اس کا جسم نازنیں

ان کا پہلا مجموعہ کلام 'وادی گل' 1963 میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ کلام 'ذکر اس پری وش کا' 1966 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے ان کی کتابیں شائع ہوتی رہیں اور قارئین ان سے استفادہ کرتے رہے۔

رفعت سروش نے شاعری کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ انھیں ناول نگار، افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، ڈرامہ نگار اور اوپیرا نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ رفعت سروش ادبی دنیا میں افسانہ نگاری کے لیے کافی کچھ کر سکتے تھے، لیکن ایسا کرنے کی بجائے انھوں نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ دی۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے کل جمع تیس چالیس سے زیادہ افسانے نہیں لکھے ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ ان کا شعر گوئی کی طرف رجحان کا ہونا ہے۔ یہ رجحان فطری بھی ہوسکتا ہے۔ ان کی افسانوی جمع پونجی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ افسانے جن میں اپنی بات کو افسانوی اسلوب میں پیش کرنے کے لیے پلاٹ کا سہارا لیا گیا اور دوسرے وہ افسانے جن میں رفعت سروش نے محض اپنی سوچ اور فکر کو الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر پیش کیا۔ ان افسانوں میں ایک صالح اور صحت مند مقصد کی دم دار جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان میں وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، وہ قاری کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے افسانوں کو قلم بند کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ذہن کی پختگی اور احساس کی گہرائی کے علاوہ وسیع مطالعے اور انسانی خواص سے آگاہی اور نفسیاتی تجربات بھی درکار ہیں۔ 1965 میں کراچی کے ماہنامہ 'ساقی' میں شائع ہونے والے 'دھندلکے کی زنجیر' کو ان کا بہترین افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں رفعت سروش نے دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے بضاعتی، زندگی کی کشمکش،

خودغرضی اور حقیقی دوست کی ضرورت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ رفعت سروش کے دوسرے افسانوں میں 'رنگوں کی چنگاریاں' اور 'مثلث' خصوصی حیثیت کے حامل ہیں۔ رنگوں کی چنگاریاں رنگوں پر مشتمل ایک انتہائی خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔ افسانہ مثلث میں رنگوں کی بجائے بے ضابطہ مگر ایک نقطے سے دوسرے نقاط کو ملا کر مثلث بنانے والی سیدھی لکیروں کی کہانی ہے۔ افسانے میں ایسے متعدد مثلث ہیں۔ ہر مثلث میں ایک بھرپور زندگی سمائی ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں میں مختلف رنگ اور مختلف زاویے ہیں۔ معاشرتی برائیوں کو جنم دینے اور ذہنوں کو جھنجوڑنے والی اقتصادی کشمکش ہے۔ ان کے افسانوں میں ضمیر فروش، نفرت کا پھول، ایک ڈوبتا جزیرہ، قلم کا درد، بے وقوف، چراغ مردہ، کلامندر، شکار، تیسری شادی اور 'کٹی پتنگ' قابل ذکر ہیں۔ دیگر بیانیہ افسانوں کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔ افسانوں میں جذبات کی عکاسی اور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ہر عمر کے جانے پہچانے اور اپنے آس پاس رہنے والے کردار موجود ہیں۔

'رفعت سروش کے دوسرے سب افسانے بیانیہ افسانوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں سیدھا سادہ پلاٹ ہے۔ قریبی کردار ہیں۔ جذبات کی عمدہ عکاسی ہے۔ زندگی کی جدوجہد ہے۔ دکھ بھری زندگی کی تصویریں ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ اور تصادم ہے۔ مقصدیت کی دل پذیر چاشنی ہے مگر کوئی بات چونکا دینے والی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سب کہانیاں ان کے افسانوی سفر کی مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ خاص طور پر ابتدائی اور درمیانی منزلوں کی۔ اسی لیے چند کہانیوں میں مختلف افسانوی کڑیوں کا وہ ربط اور وہ طاقتور اظہار اور وہ بہاؤ نہیں ملتا، جو رفعت سروش کے بعد کے افسانوں میں ہمیں متاثر کرتا ہے۔'

(رفعت سروش ہمہ کمال ادبی شخصیت: م م راجندر: 'رفعت سروش بحیثیت نثر نگار' مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد ص36)

رفعت سروش نے دسمبر 1945 میں 'آل انڈیا ریڈیو ممبئی' میں ملازمت شروع کی اور 39 برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ انھوں نے 13 برس ممبئی اور 26 سال دہلی میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہ کر بڑی فعال زندگی گزاری۔ مختلف پروگراموں کے انچارج رہے۔ گجرا، گیتوں بھری کہانی اور آخر میں اردو مجلس ان کی پہچان بن گئے۔ انھوں نے زندگی کے ہر رنگ کا خوب مزہ لیا۔ ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے میں سلیقہ شعار، ہنرمند اور مہمان نواز بیوی صبیحہ سروش نے اہم کردار ادا کیا۔ 31 جنوری 1984 کو آل انڈیا کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ قریب تین برس بعد 15 دسمبر 1987 کو اہلیہ صبیحہ سروش کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد رفعت سروش اکیلے پڑ گئے۔ غم زدہ رہنے لگے۔ غم بڑھ کر ناقابل برداشت ہو، تو انھوں نے پھر قلم اٹھایا اور ایک بار پھر لکھنا شروع کردیا۔ وہ سوچتے گئے اور ان کے ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں کے درمیان لکھنے کو بیتاب قلم کی نوک سے نکلنے والے الفاظ کے جادو اور منظرکشی نے ایسے نایاب موتی بکھیرے، جن کی چمک آج بھی باقی ہے۔ رفعت سروش کا یہ کمال محض نظموں تک ہی محدود نہیں رہا۔ انھوں نے غزلوں اور مرثیوں میں بھی ایسا کمال دکھایا کہ ہر ایک آنکھ کا کونا گیلا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک دوسرے کی جدائی اور کرب برداشت نہیں کرنے والے افراد تڑپ اٹھے۔

30 نومبر 2008 کو 84 برس کی عمر میں رفعت سروش کا انتقال ہوا، لیکن قرطاس ابیض پر ان کے قلم سے نکلے الفاظ کے جادو نے اردو ادب کے قارئین کے لیے 87 کتابیں تحریر کرنے کا ایک ایسا کارنامہ انجام دیا، جو ہر کسی ادیب و شاعر کے حصے میں نہیں آتا۔ اردو کی کتابوں میں وادیِ غزل (1963)، عروج آدم (1967)، ذکر اس پری وش کا (1968)، جہاں آرا (1973)، روشنی کا سفر (1974)، نقش صدا (1977)، شاہجہاں کا خواب (1980)، نقوش رفتہ (1983)، تاریخ کے آنچل میں (1984)، میری صدا کا غبار (1985)، پھولوں کی وادی (1986)، بمبئی کی بزم آرائیاں (1986)، اسی دیوار کے سائے میں (1987)، کرب شہنائی (1989)، قلم کے صفیر (1990)، ڈگر پنگھٹ کی (1991)، اور بستی نہیں، یہ دلی ہے (1992)، قافلہ (1994)، پتہ پتہ، بوٹا بوٹا (1996)، دھندلکے کی زنجیر (1996)، یادوں کے چاند ستارے (1996)، پانی پت (1997)، شہر غزل (1998)، زاویۂ نور (1998)، زندگی ایک سفر (1998)، سرشام (1999)، خواب اور تعبیر خواب (1999)، براڈکاسٹنگ (2000)، خانوادۂ نور (2003)، گم ہوتا آسمان (2003)، بہار نوبہار (2004)، شہر نگاراں (2004)، تھکے نہ میرے پاؤں (2005)، حرف حرف ممبئی (2006)، علم و ادب کے روشن ستارے (2006)، جہان نقش ونغمہ (2007)، ہم سخن فہم (2008)، آل انڈیا ریڈیو اور اردو (2008)، ادب شناسی (2008)، آنسوؤں کے چراغ (2008)، یادوں کا دریچہ (2010)، پھر وہی دلی کی گلیاں اور میں، شعور آگہی، شاخ گل، دیوناگری رسم الخط میں تحریر کردہ ان کی چھ کتابوں میں 'رنگ منچ کے پانچ رنگ'، 'اندھیرے اجالے کے بیچ' اور 'ریت کی دیواریں' (1987) خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ رفعت سروش کے منظوم ڈرامے، اوپیرا اور خودنوشت نے خاصی شہرت پائی۔ شاعری، افسانے، تنقید، ڈرامے اور تاریخ جیسے موضوعات پر ان کی کتابیں آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں اور انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، دیمک اور رانی لکشمی بائی کا ترجمہ کیا۔

علم و ادب کے فلک پر ان کی بلندی سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ رفعت سروش ایک اعلیٰ قلم کار اور ہمہ جہت فن کار تھے۔ انھوں نے خاص طور پر 'اوپیرا' کو جس بلند مقام تک پہنچایا وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اوپیرا منظوم غنائیہ کو کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ڈرامہ جس میں مکالمہ برائے نام ہو اور رقص وسرود و موسیقی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، اوپیرا (Opera) کہلاتا ہے۔ اوپیرا کی بابت رفعت سروش کی دختر ڈاکٹر شبانہ نذیر کی کتاب، 'اوپیرا 47ء کے بعد' کے دیباچے میں بلراج ورما نے مشہور عالم اوپیرا 'جہاں آرا' کی بابت تحریر کیا ہے۔

'سب سے طویل اور اہم تجزیہ رفعت سروش کے مشہور عالم اوپیرا 'جہاں آرا' سے متعلق ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے ناقدین اور محققین نے رفعت سروش کو اوپیرا نگاری میں سرفہرست رکھا ہے۔ ان کی ذات اور ان کے تخلیقی محرکات کے بارے میں جو تفصیلات بطور اقتباسات پیش کی گئی ہیں وہ اس باکمال فنکار کی گوناگوں شخصیت اور اوپیرا کے فن کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔'

(اردو اوپیرا (47 کے بعد)، مصنف: ڈاکٹر شبانہ نذیر، دیباچہ: بلراج ورما جنوری 1997 ص 21)

رفعت سروش کی نثر انتہائی سادہ، آسان اور شگفتہ ہے۔ لیکن افسوس رفعت سروش کے شعری اور فنی محاسن پر نہ تو اتنی توجہ دی گئی اور نہ ہی اتنا کچھ تحریر کیا گیا، جتنا ان کے بارے میں تحریر کیے جانے کا حق تھا۔

■

M. A. 'Kanwal' Jafri
127/2, Jama Masjid,
NEENDRU, Tehsil Dhampur,
District: Bijnor (U.P.) 246761
Email: jafrikanwal785@gmail.com
09917767622, 09675767622

رفیع الدین ناصر

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

کتابیں انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف نے انسانی سوچ میں کافی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ تخیلی ادب نے اردو قاری کو بہترین زبان و بیان سے روشناس کرایا۔ مختلف حالات و واقعات کو کہانیوں، افسانوں، ناولوں، نظموں و غزلوں کی شکل میں قاری کو واقف کرایا وہیں ادب نے حقائق کو قاری کے سامنے پیش کر کے حالات حاضرہ کے چڑھاؤ اُتار سے واقف کرایا۔ ان حقائق میں ہمارے ماحول میں ہونے والی تبدیلیاں، ہماری صحت پر اثرات، اس کے تحفظ کے اقدامات اور بہترین زندگی جینے کے طریقے قاری کو بتلائے۔ چونکہ اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے اور اردو قلمکاروں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کر کے اردو قاری کو جینے کے طریقے بتلائے۔ اردو ادب میں سائنسی ادیبوں کی ان خدمات کی جتنی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ اگر ہم صحتمند رہیں گے تب ہی تو ہم زندگی کے دیگر امور صحیح طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ اپنی زبان و بیان کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں۔ بہترین غزلیں، بہترین افسانے، بہترین ناول لکھ سکتے ہیں اور سائنس کی ان جدید ایجادوں کی مدد سے دنیا کے کونے کونے میں آسانی سے پہنچا سکتے ہیں۔ یہ سائنسی علوم ہی ہیں جن سے انسانوں کو بہترین زندگی گزارنے کے گر آئے۔ اس لیے اردو قاری کو سائنسی علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر ملک کے نامور ماہرین سائنس نے اردو زبان میں جدید سائنسی تحقیقات کے ساتھ حفظان صحت اور دیگر سائنسی علوم کو اردو زبان میں پیش کیا تا کہ اردو قاری ان جدید سائنسی علوم سے واقف ہو کر صحت مند زندگی گزارے اور جدید دور میں ملک و قوم کی ترقی میں اپنا تعاون پیش کرے۔

اگر ہم اردو سائنسی ادب پر نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں صوبۂ مہاراشٹر کا گراں قدر تعاون نظر آتا ہے۔ اسی لیے آج کا ہمارا مطمحِ نظر مہاراشٹر میں چھپی بے شمار اردو سائنسی کتابوں میں سے وہ کتابیں ہیں جنھوں نے ہم کو متاثر کیا۔

ریاست مہاراشٹر مراٹھواڑہ، ودربھ، خاندیش، کوکن اور ممبئی ڈویژن پر مشتمل ہے۔ مراٹھواڑہ آزادی سے قبل نظام کے زیر تسلط رہا، اس لیے یہاں پر اردو کی آبیاری بہت معیاری ہوئی۔ آج بھی مراٹھواڑہ کے تمام اضلاع میں نہ صرف اردو اسکولوں کی کثیر تعداد موجود ہے بلکہ اردو میڈیم کے جونیئر کالج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ جن سے ہر سال کئی طلبا کامیاب ہو کر میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر کورسیس میں داخلہ لے کر اعلیٰ درجوں میں کامیابیاں حاصل کر کے معیاری زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پر تخلیق کیا جانے والا ادب بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مراٹھواڑہ کے سائنسی ماہرین نے اردو قاری کو اپنے رشحات قلم سے زندگی سے جڑے تمام سائنسی علوم سے واقف کرایا اور اردو دنیا کے قاری کو بہت متاثر کیا۔

سائنسی قلمکار کی حیثیت سے مراٹھواڑہ میں دور حاضر میں بہت احترام سے لیا جانے والا نام کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ کا ہے جو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے سابق صدر شعبہ حیوانات اور سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر رفیق زکریا سینٹر فار ہائر لرننگ رہ چکے ہیں۔ آپ نے علاقے کے تمام سائنسی و ادبی قلمکاروں کی بھرپور رہنمائی کی ہے اور یہ فیض ابھی بھی جاری ہے۔ اسی میں سے ایک راقم الحروف بھی ہے۔ آپ نے آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد کے توسط سے انتہائی اعلیٰ معلومات بہم پہنچائی جن کو سن کر سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان ریڈیو تقاریر کو انھوں نے جب کتابی شکل میں شائع کیا تو اس نے نہ صرف اردو قاری کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے یہاں رہبری کا کام انجام دیا۔ آپ کی سب سے پہلی کتاب 'سائنسی شعاعیں' ہے جو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی ممبئی کے مالی تعاون سے 2001 میں منظر عام پر آئی۔ اس کے پیش لفظ میں پروفیسر مجید بیدار رقمطراز ہیں کہ ''سائنسی شعاعیں کوئی مربوط کتاب نہیں بلکہ کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ کے لکھے ہوئے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو وقت بہ وقت مختلف موضوعات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔'' کتاب 'سائنسی شعاعیں' میں مصنف کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ نے کل 22 مضامین کو پیش کیا۔ ہر ایک مضمون معلومات سے پُر ہے۔ تمام مضامین اچھوتے اور آج کے اس جدید دور میں بھی معلومات کا خزانہ معلوم ہوتے ہیں۔ آج بھی جب کتاب کا مطالعہ ہوتا ہے تو پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں موجود چند اہم عناوین ہیں: کروموزومس یا مجرمین، جانوروں میں چند دلچسپ حقائق، پرندوں میں سیلانی کیفیت، پرندوں کی اجتماعی خودکشی، کیا جانور بھی باتیں کرتے ہیں وغیرہ۔ اس کتاب کے بعد کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ کی دوسری کتاب 'ریشم سازی' 2016 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے ریشم کی صنعت کی تکنیکی معلومات آسان زبان میں بہم پہنچائی۔ مصنف نے مختلف تصاویر کی مدد سے ریشم کے کیڑے کے دور حیات سے لے کر اس صنعت سے حاصل ہونے والی تمام مصنوعات کو سمجھایا۔ ہم ریشم کے استعمال کو صرف کپڑے کی صنعت تک ہی محدود رکھتے ہیں جبکہ ریشم کے دھاگے کا استعمال پیراشوٹ، رسیاں، کارتوس کے بیگ، ٹیلی فون انڈسٹری میں وافر مقدار میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی کشمیر اور بنگلور کے سینٹرل سلک بورڈ نے کثیر مقدار میں کتابیں خرید

لیں اور کئی نوجوانوں نے کامیابی سے ریشم سازی کو شروع کیا اور دوسروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

کتاب ’قرآن اور تخلیق انسانی‘ ڈاکٹر کیپٹن ایم ایم شیخ کی تیسری شاہکار تصنیف ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے 26 عناوین کے تحت اس موضوع پر علمی اور سائنسی معلومات فراہم کی ہیں۔ انسانی علم جنینیات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی حضرت آدمؑ، حضرت حواؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو مختصراً بتلایا۔ اس کتاب میں قدرے تفصیل سے انسانی جسم کے مطالعے کو بیان کیا۔ قرآن کریم کا استدلال اور تخلیق انسانی سے بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں قرآن کریم کا سائنسی اعجاز سائنسدانوں کی نظر میں موریس بوکائے، ڈاکٹر کیتھ مور، ڈاکٹر عبدالمجید زندانی کے بیانات کو لکھا گیا ہے۔ پوری کتاب معلومات کا خزانہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد ذہن متاثر ہوتا ہے۔

شہر اورنگ آباد کی قلمکار محترمہ رفعت النسا نے اردو قاری کے لیے سائنسی کتابیں تحریر کیں۔ ان کی کتاب ’ماحول اور قابل بقا ترقی‘ عام اردو قاری کو ماحول کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ترقی کے گر بتلاتی ہے۔ کتاب ماحول اس کے تحفظ اور قابل بقا ترقی کے تعلق سے مختلف معلوماتی مضامین کا احاطہ کرتی ہے جو قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ محترمہ شائستہ محمدی نے اردو قاری کے لیے عام معلومات پر مبنی کتاب ’نباتی سائنس‘ شائع کر کے نہ صرف طلبا بلکہ عام اردو قاری کو نباتات کے فوائد سے واقف کرایا جو اردو قاری کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ اسی شہر کے نوجوان قلمکار جو اردو زبان کے اُستاد ہیں انھوں نے علم ماحول جیسے موضوع پر خامہ فرسائی کر کے مختلف اکیڈمیوں کے اعزاز حاصل کیے بلکہ عام اردو قاری کے ذہنوں کو متاثر کر کے انھیں ماحول کی اہمیت سے انتہائی سادہ زبان میں واقف کرایا۔ شہر اورنگ آباد کے قلمکاروں نے اردو زبان میں سائنسی معلومات فراہم کر کے گویا اردو زبان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کا ایک اور معتبر نام پروفیسر خواجہ عبدالنعیم ہے جنھوں نے ’مسالہ جات‘ جیسی کتاب تحریر کر کے اردو قاری کو مختلف مسالوں کی اہمیت سے واقف کرایا۔ مسالوں کی کاشت کے طریقے بتلائے۔ ہر ایک مسالے کے درخت کو رنگین تصویر کی مدد سے پیش کیا جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔ جس نے اردو قاری کو بہت متاثر کیا۔

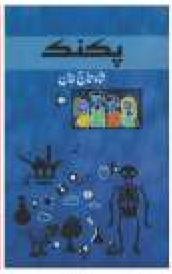

مراٹھواڑہ کے دیگر اضلاع کے قلمکاروں نے بھی سائنس کے توسط سے اردو کی آبیاری کی کامیاب کوشش کی۔ اس سلسلے میں ناندیڑ سے تعلق رکھنے والے جناب سید اختر علی کا نام اردو سائنسی دنیا میں بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ درس و تدریس سے وابستہ رہے اور اب مکمل طور سے سائنس کے توسط سے اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اب تک آپ کی بچوں اور بڑوں کی کل دس سے زائد سائنسی کتابیں منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ حال ہی میں آپ کی شائع شدہ کتاب ’رومن اعداد‘ معلومات کا خزانہ ہے جس میں ابتدا سے آج تک رومن اعداد کی تاریخ ان کا استعمال اور موجودہ دور میں ان کے استعمال پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ رومن اعداد کا استعمال اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لیے آپ کی آٹھ سے زائد سائنسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو مختلف سائنسی ایجادیں، سائنسی سمجھ، فہم، ادراک اور معلومات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کے مطالعے کے بعد بچے اور بڑے دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ جناب سید اختر علی پابندی سے اردو زبان میں انتہائی معیاری اور معلوماتی مضامین شائع کرتے رہتے ہیں جس کو پڑھ کر اردو قاری کا ذہن بہت متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ضلع پربھنی سے تعلق رکھنے والے جناب عزیز احمد ہاشمی بھی پابندی سے سائنسی مضامین منظر عام پر لاتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ’سائنسی کوئز‘ منظر عام پر عام ہوئی۔ یہ کتاب سائنس کے مختلف علوم کا احاطہ سوال و جواب کی شکل میں کرتی ہے۔ اس سے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی سائنس کی بنیادی معلومات سے آگہی ہوتی ہے جو ایک متاثر کن بات ہے۔

مہاراشٹر کی سائنسی نسائی قلمکاروں میں شاہ تاج خان صاحبہ (پونا) کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے سائنسی مضامین پابندی سے لکھتی رہتی ہیں۔ حال میں آپ کی کتاب ’پکنک‘ منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ’پکنک‘ دراصل سائنسی کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں فاضل مصنفہ نے ادبِ اطفال کو سائنسی حوالوں سے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی قدر دانی ملک کی مختلف اکیڈمیوں نے کی اور انھیں اعزازات سے نوازا۔

ممبئی اور اس کے اطراف و اکناف کے سائنسی قلمکاروں نے بھی سائنس کے توسط سے اردو کی بہت خدمت کی۔ پروفیسر سید اقبال نے مقامی روزنامہ کے لیے ’سائنس اور سماج‘ کے عنوان سے مسلسل مضامین لکھے، ان مضامین میں سے کل 50 چنندہ مضامین کا انتخاب کر کے جناب سید خالد نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ کتاب سماج اور اس سے جڑے سائنسی مفروضوں کا ہلکے پھلکے انداز میں احاطہ کرتی ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ مکمل، دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے جس کو پڑھ کر قاری بہت متاثر ہوتا ہے۔ ممبئی سے قریب بھیونڈی کو اردو کا گڑھ مانا جاتا ہے یہاں کے قلمکاروں نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ سائنس کی بھی خاطر خواہ خدمت کی ہے۔ یہاں کی بہت مشہور شخصیت ڈاکٹر ریحان انصاری (مرحوم) جو سائنسی سرگرمی میں پیش پیش رہتے تھے اُن کی کتاب ’شعور صحت‘ منظر عام پر آ کر بہت پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ ڈاکٹر ریحان انصاری چونکہ پیشے سے ڈاکٹر تھے اس لیے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو انھوں نے اردو قاری کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے اپنی تحریروں کے ذریعے بھرپور کوشش کی۔ 33 مختلف عناوین پر مشتمل اس کتاب میں ڈاکٹر ریحان انصاری نے انسانی صحت سے جڑے کئی مسائل اور اُن کے تدارک کو انتہائی سادہ زبان میں اردو قاری کے لیے پیش کیا۔ جا بہ جا مناسب اور صاف ستھری تصاویر کے اضافے کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اردو قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اردو زبان میں بھی اس معیار کا معلوماتی مواد دستیاب

ہے جو ایک متاثر کن بات ہے۔ اسی شہر کے ایک اور مصنف ہیں جناب عبدالملک مومن جو سائنس کے معلم رہ چکے ہیں اور سائنس کے متعلق خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب 'پانی اور ہمارا ماحول' بچوں اور بڑوں دونوں میں یکساں مقبول ہوئی۔ کیونکہ اس کتاب میں عبدالملک مومن صاحب نے 18 چھوٹے چھوٹے مضامین کے توسط سے پانی اور اس سے وابستہ ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ زبان سادہ ہونے سے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ بہترین تصاویر کی پیشکشی سے بچوں کے ذہنوں پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں جس سے پانی کے تحفظ کے تعلق سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بھیونڈی سے کچھ دور موجود شولاپور کے نوجوان مصنف جناب جنید عبدالقیوم شیخ نے بچوں کے لیے سائنسی کتابیں لکھ کر اپنے علاقے میں ایک نیا رجحان پیدا کیا۔ ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب 'انسانی جسم کے اہم اندرونی اعضا' انسانی جسم کی معلومات کا خزانہ ہے۔ مصنف نے مختلف تصاویر کی مدد سے انسانی جسم کے اندرونی اعضا کی ساخت، افعال اور بہترین کارکردگی کے نسخے بہترین انداز میں سمجھائے، جس کو پڑھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا جسم کس طریقے سے بنایا ہے۔ شیخ جنید کی دوسری کتاب 'مسلم سائنس دانوں کی خدمات' اردو قاری کو سائنس دانوں کے تعلق سے معلومات فراہم کرتی ہے۔ خالصتاً بچوں کے لیے جناب شیخ جنید نے منرولیف کی تحریر کردہ کتاب کو اردو قالب میں بعنوان 'سائنس برائے لطف' پیش کر کے سائنسی ادبِ اطفال میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اس میں موجود چھوٹی چھوٹی قلمی تصویریں بچوں کو سائنسی گتھیاں سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔

مہاراشٹر کا دوسرا اہم زرخیز اردو سائنسی قلمکاروں کا علاقہ ناگپور ہے۔ ناگپور اور اس سے متصل کامٹی کے اردو سائنسی قلمکاروں نے سائنسی دنیا میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ چونکہ اس خطے میں اردو اسکول اور جونیئر کالجس کافی تعداد میں ہیں اس لیے یہاں پر اردو قاری کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی سائنسی معلومات میں اضافے کی خاطر یہاں کے سائنسی قلمکاروں نے بہت محنت کی۔ اس میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس کا ہے۔ جنھوں نے سائنس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے خامہ فرسائی کر کے کثیر تعداد میں کتابیں شائع کیں۔ ان کی حال ہی میں شائع شدہ کتاب 'مچھر سے لاحق بیماریاں' معلومات سے پُر کتاب ہے جس میں ڈاکٹر رفیق نے ملیریا، ڈینگو اور چکن گنیا جیسی بیماریوں کی نہ صرف تفصیلات پیش کیں بلکہ ان سے حفاظت کے طریقے بھی بتلائے۔ 350 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف تصاویر سے پُر ہے، جس کی وجہ سے قاری کو متن سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس میں ڈاکٹری اصطلاحات کو آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جب اس کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے

دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور وہ پوری کتاب مکمل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ ویسے تو ڈاکٹر رفیق اے ایس کی اب تک 20 سے زائد سائنسی کتابیں منظر عام پر آ کر شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ کچھ کتابوں کے تو کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے ان کی اب تک پانچ کتابیں شائع کیں جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، جن میں بطور خاص پیٹ کے کیڑے، منشیات، ماحولیات ایک مطالعہ، ہمارا ماحول قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رفیق نے ماحول کے تعلق سے کئی کتابیں شائع کیں اور اردو قاری کو اپنے اطراف کے ماحول سے واقف کرایا نیز اس کے تحفظ کے گر بتلائے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی مختلف اکیڈمیوں نے انھیں اعزاز سے نوازا۔ اسی وجہ سے ناگپور سے شائع ہونے والے رسالہ 'الفاظ ہند' کے مدیر جناب ریحان کوثر نے ڈاکٹر رفیق پر مارچ۔ اپریل 2023 کا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ یہ خصوصی شمارہ ڈاکٹر رفیق کی اردو سائنسی خدمات کا اعتراف ہے۔ ناگپور کی ہی ایک دوسری اہم شخصیت ڈاکٹر محمد ابوالکلام ہے جنھوں نے بچوں کے لیے اب تک چھ سائنسی کتابیں تحریر کیں۔ یہ کتابیں کہانیوں اور ناولوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اُن کا ماحولیات کے موضوع پر بچوں کا تحریر کردہ ناول 'غبار' منظر عام پر آ کر نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے دلوں میں بھی اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے ناگپور کے براہِ راست آلودگی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا تذکرہ کیا جس کو فاضل مصنف نے دلچسپ اور تجسس سے پُر انداز میں کہانی کی شکل میں پیش کر کے اردو قاری کو بہت متاثر کیا۔ ان کی دیگر کتابیں بھی اسی طرح دلچسپی اور تجسس سے پُر ہے۔ کامٹی سے تعلق رکھنے والے مرحوم ڈاکٹر جاوید احمد نے اپنی حیات میں اردو زبان میں سائنسی مواد فراہم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب 'سائنس ہمارے آس پاس' مختلف سائنسی مضامین کا مرقع ہے، جس میں ڈاکٹر جاوید نے 27 مختلف عناوین کے تحت قاری کی جدید تحقیقات اور نئی نئی سائنسی باتوں سے واقف کرایا۔ یہ مضمون تجسس سے پُر اور معلومات کا خزانہ ہے جو اردو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اس میں موجود تصاویر قاری کو سائنسی مفروضے سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔

سائنس دراصل ایسا وسیع سمندر ہے جو معلومات سے پُر ہے۔ ان معلومات کا تعلق براہِ راست ہماری زندگی اور ہماری صحت سے ہے اس لیے یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ قدرت میں پنہاں رازوں کو ہم جانیں، سمجھیں اور اُن پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ مہاراشٹر کے کئی سائنسی قلمکاروں نے ان معلومات کو اردو قاری تک پہنچانے کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کی۔ ان تمام کا احاطہ ان صفحات میں کرنا ممکن نہیں۔ لیکن جن کتابوں نے بہت متاثر کیا اُن کا تذکرہ ضروری تھا تا کہ اردو قارئین بھی مہاراشٹر کی اردو سائنسی خدمات کو جانیں اور جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اُس کو حاصل کریں اور اپنے اور اپنی نسلوں تک ان معلومات کو پہنچائیں تا کہ ہم ملک کی ترقی میں قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

■

Dr. Rafiuddin Naser
(National Awardee Teacher)
Head Department at Botany,
Maulana Azad College of Arts
Science and Commerce
Dr. Rafiq Zakaria Campus, Rauza Bagh,
Aurangabad-431001 (MS)
Mobile: 9422211634
Emial: rafiuddinnaser@rediffmail.com

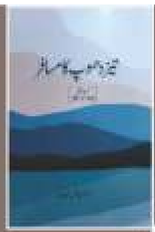

منور حسن کمال

تابش مہدی

'تعبیر' سے 'غزل خوانی نہیں جاتی' تک

تابش مہدی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک طرف اپنی کلاسیکی اور جدیدیت آمیز نکھری شاعری کے سبب معروف تھے اور دور دراز یہاں تک کہ غیر ممالک کے عالمی مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے اور اپنے سادگی سے مترنم آواز سے مشاعروں کی فضا بدل دیتے تھے وہیں ایک عمدہ نثر نگار اور ناقد کے طور پر بھی اپنی خصوصی شناخت رکھتے تھے۔ پچاس سے زیادہ ان کی تصنیفات و تالیفات اس امر پر دال ہیں۔ شاعری کے طور پر تو وہ معروف تھے ہی، لیکن جب انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے جامعہ کے تناظر میں 'اردو تنقید کا سفر' پر مغز مقالہ لکھ کر جامعہ سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تو ان کی تصنیف کے چہار دانگ عالم میں چرچے شروع ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تنقید کے میدان کے شہسوار بھی کہلانے لگے۔

اپنے چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں سے انھوں نے نثرنگاری کے بھی وافر مقدار میں نمونے پیش کیے ہیں۔ وہ نہایت خلیق، نستعلیق، وضع دار اور ایک علم دوست انسان کے طور پر بھی امروہہ دیوبند اور دہلوی تہذیب کا ایک کامل نمونہ تھے۔ وہ اگر چہ 22 جنوری 2025 کی صبح اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے لیکن اپنے پیچھے کثیر تصانیف کے ساتھ ساتھ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بھی چھوڑ گئے جس میں شاعری کے ساتھ نثرنگاری میں بھی انھوں نے اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کی خوب رہ نمائی کی اور ان کا رشتہ قلم و کاغذ سے ایسا جوڑا کہ ان میں سے اکثر آج شہرت بلندیوں پر ہیں، لیکن ایسے شاگردوں کی تعداد کم ہی ہے جو انھیں اپنا نثری اور شاعری دونوں میدانوں میں ایک استاذ کے طور پر متعارف کراتے ہیں، ورنہ بہت بڑی تعداد ایسے شاعروں، نثرنگاروں اور ناقدوں کی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ان سے صرف مشورہ لیتے تھے۔

راقم آج تک یہ بات سمجھنے سے خود کو کمزور پاتا ہے کہ کیا مشورہ لیے بغیر کسی سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے؟ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے خردوں کے مضامین اور غزلیں کہیں شائع دیکھتے تو انھیں خود کال کرتے اور اپنی جانب سے دعاؤں کے ساتھ نہایت خوشی کا اظہار کرتے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے کہ مسلسل لکھتے رہیے اور مشق سخن جاری رکھیے، اس سے قلم رواں رہتا ہے۔ شاعری کے لیے ان کا کہنا تھا کہ اس میں استقلال آنا چاہیے اور چلتے پھرتے اپنے اشعار گنگناتے رہیے اور شاعری کو جز وقتی نہیں ہمہ وقتی اپنائیے، تبھی آپ شاعری میں کوئی نام پیدا کر سکیں گے۔ یہ باتیں انھوں نے راقم سے بھی ایک سے زیادہ مرتبہ کہی ہیں کہ شاعری کو مکمل وقت دیں اور اساتذہ کے کم از کم ایک ہزار اشعار یاد رکھیں۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ادبی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے، بلکہ اردو دنیا ایک ہمہ جہت شاعر (نعت، غزل اور نظم) نثرنگار اور نقد کی دنیا کی بے مثال شخصیت سے بھی محروم ہوگئی ہے۔

تابش مہدی نے اپنے اساتذہ پر بہت کھل کر لکھا ہے اور ان کے احترام و عقیدت کے اپنی تحریروں میں ایسے موتی بکھیرے ہیں، جن سے ان کے علمی شعور اور فنی پختگی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے اساتذہ میں علامہ ہلالی علی آبادی، مولانا عمر عثمانی اور علامہ شہباز امروہوی نہایت باکمال، نامور اور فکر و فن کی دنیا میں باوقار اور اپنی شاعری اور نثر نگاری کے باوصف اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔ اپنے اساتذہ سے متعلق تابش مہدی نے علامہ شہباز امروہوی کی سلطان سخن اور مجتہد فکر و فن سے تعبیر کیا ہے، وہیں مولانا عامر عثمانی کو اپنا علمی و فکری رہنما تسلیم کیا ہے۔

دیوبند میں مشہور ماہنامہ تجلی (مدیر اعلیٰ: مولانا عامر عثمانی اور پندرہ روزہ اجتماع دیوبند سے وابستگی کے دوران تابش مہدی: تابش عامری تھے، اس پر بعض حضرات کے اعتراض کے بعد انھوں نے اپنے نام 'مہدی حسن' سے 'مہدی' اخذ کر کے تابش مہدی لکھنا شروع کیا اور اس نام سے ہی وہ شہرت پائی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شہباز امروہوی اپنے ایک خط میں تابش مہدی کو لکھتے ہیں:

''آپ اگر اپنے نام کے ساتھ 'عامری' لکھتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کو اس پر اعتراض کیوں ہے؟ لیکن آپ نے اپنا نام جو تابش مہدی لکھا ہے، وہ میرے نزدیک مہدی تابش زیادہ صحیح ہے، یعنی اصلی نام پہلے اور تخلص پیچھے۔'' (ایضاً، ص 138)

شاید یہی وہ پہلی آخری بات ہے جس سے تابش مہدی نے علامہ شہباز امروہوی کی بات سے اختلاف کیا ہے، ورنہ پوری کتاب 'عرفان شہباز' میں جو تابش مہدی کے شہباز صاحب سے متعلق مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، کہیں کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی کہ انھوں نے علامہ شہباز کی کسی بات سے یک سر مو بھی اختلاف کیا ہے۔ وہ ان کی بہت زیادہ قدر و منزلت کرتے تھے اور اکثر ملاقاتوں میں ان سے متعلق علمی و فنی موضوعات پر قصے بھی سناتے رہتے

تھے، جو میرے خیال سے انھیں علامہ شہباز سے محبت و مودت کے سبب ازبر تھے۔

جہاں تک تابش مہدی کے شعری رویوں اور ان کی ابتدائی شاعری سے متعلق بات ہے تو انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں نے شاعری کب شروع کی؟ اس کی صحیح تاریخ تو مجھے نہیں معلوم۔ البتہ یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں تیسری کلاس کا طالب علم تھا، بیت بازی کے بین المکاتب مقابلے میں میں نے شرکت کی۔ ایک بار جب کوئی شعر میرے ذہن میں نہیں آیا تو میں نے اپنی طرف سے جوڑ گانٹھ کر شعر بنا کر پیش کر دیا تھا، جسے ججوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان مقابلوں میں عام طور سے پڑھے لکھے اور سخن شناس اساتذہ اپنے اپنے اسکولوں کے طلبا کو لے کر شریک ہو گئے تھے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میرا وہ شعر شعریت اور شعر کی جملہ باریکیوں سے لیس نہ رہا ہو، لیکن یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ وہ شعر موزوں رہا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں یہیں سے میری شاعری کی بنیاد پڑی۔''

(تابش مہدی: پہچان اور پرکھ، ترتیب و تدوین: امتیاز وحید، بالشاہ، قاری عبدالعزیز اظہر، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، مطبوعہ 2015، ص282)

تابش مہدی اعلیٰ ادبی اقدار کے شاعر تھے۔ ان کے مجموعہ کلام 'تعبیر' پر راقم نے ڈرتے اور جھجکتے ہوئے لکھا تھا۔ اگر ان کی غزلوں کا محاسبہ کیا جائے تو دو چار شعر بھی ایسے نہیں نکلیں گے کہ فنی اعتبار سے ان پر کوئی کلام کیا جا سکے۔ 'تعبیر' کے مطالعے کے دوران دو تین جگہوں کی راقم نے نشاندہی کی، لیکن اس پر وہ چراغ پا ہونے کی بجائے خوش ہی ہوئے اور اس تبصرے کو اپنی کتابوں میں جگہ دی۔

دونوں شعر درج ذیل ہیں۔

جہاد کرنے چلا ہوں میں تیرے دشمن سے
مرے خدا مجھے ہارون جیسا بھائی دے

اتنا تم مجبور نہ سمجھو، ہم اتنے مجبور نہیں
جس دن میداں میں اتریں گے لاکھوں سر لے جائیں گے

پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں 'ہارون' اور دوسرے شعر میں 'اتریں گے' توجہ طلب ہے۔ اب یہ تو علم عروض کے ماہرین ہی بتائیں گے کہ یہ شکست ناروا کی کون سی قسم ہے۔ بظاہر کوئی ایسی خامی نہیں ہے جس پر انگشت نمائی کی جائے، چونکہ اس قسم کے سقم سے غالب و اقبال کی شاعری بھی مبرا نہیں ہے اور یہ بھی الگ بات ہے کہ اس سقم سے آج کی بڑی قد آور شخصیتیں بھی نہیں بچ پائی ہیں۔ راقم نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ وہ میرے استاد ہیں اور یہ درس بھی انہی کا دیا ہوا ہے کہ 'کبھی کسی کی رعایت نہ کرنا چاہے میں ہی کیوں نہ ہوں' اس لیے میں نے تذکرہ کر دیا تھا۔''

(تابش مہدی: پہچان اور پرکھ، ص119,120)

تعبیر ان کے شعری مجموعہ 1989 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس زمانے میں جگہ جگہ فسادات ہوتے تھے اور ان کا اثر علاقائی سطح پر اس دور کے معاشرے پر نظر آتے تھے۔ تو شاعر جو حالات کا نباض ہوتا ہے، اور اس سے بے خبر کیسے رہ سکتا تھا۔ تابش مہدی نے اس زمانے میں بڑے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی رنگ کے اشعار کہے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

یہ بات تو تاریخ میں ملتی نہیں صاحب
تسبیح و مصلی تو ہے تلوار نہیں ہے

(تعبیر، ص23)

مصلحت اندیشیِ ایام سے ہوکر الگ
جنگ کی خاطر تمھیں تیار ہونا چاہیے

(تعبیر، ص61)

پیکرِ مصلحت ہے ہر ایک آدمی
کسی سے ملیے، کسے رہ نما کیجیے

(تعبیر، ص26)

ہر آدمی اوڑھے ہے تقدس کا لبادہ
لگتا ہے یہاں کوئی گنہگار نہیں ہے

(تعبیر، ص32)

تابش مہدی کا ایک مجموعہ کلام 'کنکر بولتے ہیں' ہے۔ غزل سے متعلق تابش مہدی کا نظریۂ فن اس طرح سامنے آتا ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کو نئی وسعتیں دینے کی سعی کی ہے۔ 'نقد غزل' جوان کی ایک اہم کتاب ہے، اس میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''غزل میں نئے اور نادر مضامین کی دریافت ایک دشوار کام ہے۔ غزل کے فارم میں دو چار شعر موزوں کر لینا بہت آسان ہے، لیکن کوئی نادر اور اچھوتا مضمون پیش کر کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔'' (نقد غزل، ص38)

تابش مہدی کے ہاں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن سے ان کی فکری جولانیاں تو نمایاں ہوتی ہیں، ایک ہی قافیہ میں الگ الگ مضمون بھی پیش کیا ہے۔ 'کنکر بولتے ہیں' ان کا ایک اہم شعری مجموعہ ہے، جس سے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں اور دونوں کو بہ انداز دگر پڑھیں اور لطف لیں۔

چھین لی جس نے زندگی میری
وہ حقیقت میں میرا بھائی ہے

بھائی بھائی کو کیوں لڑاتے ہو
آخرکار بھائی، بھائی ہے

یہاں الطاف حسین حالی کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ ''شاعری ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتی ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتی ہے، مگر کبھی وہ ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتی، جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔''

اب ایک مرتبہ پھر درج بالا اشعار پڑھیے تو لطف دوبالا ہو جائے گا۔ ساتھ ہی درج ذیل شعر بھی پڑھیں اور لفظ 'پڑوسی' کے کردار کا مشاہدہ کریں۔

پڑوسی کے بچے بلکتے رہے
پڑوسی کے گھر جشن ہوتا رہا

بہت سے ناقدین فن اس بات پر متفق ہیں کہ تابش مہدی کی شاعری مقصدی شاعری ہے، جس نظریے کا علم انھوں نے بلند کیا ہے اس کے بلا تامل اظہار بھی کیا ہے۔ تابش مہدی فن کی جن بلندیوں پر پہنچے ہیں اس میں ان کے اساتذہ کا دخل تو ہے ہی، جس کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا ہے (گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے) لیکن اسے رب کریم کا خصوصی فیضان بھی کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

رباعیات کے اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر ناوک حمزہ پوری کے مطابق ''تابش مہدی حساس دل اور بیدار مغز لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے شاندار ماضی پر ان کی گہری نظر ہے۔ حال پر ان کی کڑی نگاہ ہے، ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے۔''

(تابش مہدی: پہچان اور پرکھ، ص86)

اس حوالے سے جب تابش مہدی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اس طرح کے اشعار ذہن و دل کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مری نظر میں ادب ہی نہیں وہ اے تابش
جو میری قوم کے بچوں کو بے حیائی دے

اے رئیسِ محلّہ خبر ہے تجھے
کس لیے تیرا ہم سایہ مغموم ہے

خوشبوئیں گھر سے باہر نکلنے نہ دو
ہر نظر اس گلی کی ہوس ناک ہے

ادب نوازوں نے نظیرا کبرآبادی کی مشہور نظم ’آدمی نامہ‘ ضرور پڑھی ہوگی اور آدمی کے مختلف رنگ و روپ کا مطالعہ کیا ہوگا۔ نظیرا کبرآبادی کی اپنی سوچ وفکر ہے اور انھوں نے اپنے انداز میں آدمی کی شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اور تابش مہدی نے آدمی، آدمیت اور انسان کے جوہر اصلی کی طرف اپنے مفکرانہ لہجے میں گفتگو کی ہے، بلکہ درج ذیل اشعار میں آپ دیکھیں گے کہ آخری دو شعر ’نعت رنگ‘ ہیں۔

پہلے یہ شعر دیکھیں۔

آدمی تم بھی ہو اور ہم بھی مگر
آدمیت سے ہر شخص محروم ہے

آدمی، آدمی ہیں برابر مگر
سوچتا ہی نہیں یہ کوئی آدمی

اور یہ نعت رنگ دیکھیں۔

آدمی کو آدمیت سے شناسا کردیا
اللہ اللہ وہ بھی تھا کس درجہ اچھا آدمی

آدمی کے کارناموں کو بھلا سکتا ہے کون
کر گیا روشن جہاں کو ایک تنہا آدمی

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا تھا:

”غزل کی رفتار زمانے سے ہم آہنگی، بدلتے ہوئے رجحانات کی ترجمانی، معاشی و معاشرتی حالات کی عکاسی اور غور وفکر کی آئینہ دار اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ غزل میں باوجود محدود ہونے کے ایک وسعت ہے اور ہر حال میں بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت اور مناسبت پیدا کرسکتی ہے۔“

(ڈاکٹر عبادت بریلوی: غزل اور مطالعہ غزل، ص254)

تابش مہدی کے ہاں غزل کے یہ بدلتے ہوئے رجحانات بڑی شدت سے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں۔

اک کارزارِ جہدِ مسلسل ہے زندگی
سرسوں ہتھیلیوں پہ جماتا نہیں کوئی

نہایت مختصر ہے زندگانی
نہایت مختصر سامان رکھیے

تابش مہدی کا ایک مجموعہ کلام ’غزل نامہ‘ ہے، جس میں غزل کا حسن تجسیم ہر شعر میں اپنے جلوے بکھیرتا ہے اور کندن بدن نظر آتا ہے۔ غزل کی تاریخ، اس کی ارتقائی شکلیں اور تدریجی جہانِ معنی دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ غزل نامہ میں حسنِ ترتیب اپنے پورے شباب پر ہے۔ اس کی تمام غزلوں میں ایک ایسی روحانی فضا نظر آتی ہے، جو اپنے جلو میں ایک عجیب سا سرور بخش اور پاکیزہ تخیل رکھتی ہے۔ اس میں مذہبی اقدار کی تجدید بھی نظر آتی ہے اور ایک حد تک تجدید بھی۔ غزل کی ماہیت اور فکری معنویت اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے باوصف نمایاں ہے۔ ساتھ ہی فکری اور نظری احتیاط کا دامن بھی انھوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ ہمارے سرمایۂ غزل میں اس طرح کی شاعری نایاب نہ سہی کم یاب ضرور ہے۔ درج ذیل اشعار میرے خیال کی تصویب ضرور کریں گے۔

سوزِ غم حیات ہماری غزل میں ہے
اک روحِ کائنات ہماری غزل میں ہے

جس پہ تیری روایت نہیں منکشف
وہ نہ شاعر، نہ فنکار ہے اے غزل

بقراط و جالینوس بھی موجود ہیں یہاں
روحِ جنید و شبلی و حسان غزل میں

تیرے اک اک شعر میں ہے فلسفہ
تیرا لہجہ کائناتی ہے غزل

غزل سے بدگمانی توبہ توبہ
روایت غیرفانی ہے غزل کی

غزل کے یہ محض حوالے نہیں ہیں، بلکہ اس کے کائناتی اور بنیادی ستون ہیں، جن کے ادبی تناظر اپنی انتہاؤں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ غزل کے مزاج آشنا یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ غزل ندرتِ خیال، لطافتِ بیان اور نزاکتِ ہنر کا جیتا جاگتا ایسا شاہکار ہے جہاں اشتہاریت ممنوع ہے، اس لیے کہ جہاں اس میں اشتہاریت پیدا ہوئی، وہیں وہ ابتذال کی کسی نہ کسی حد کی پابندی سے گریزاں ہوجاتی ہے اور اپنے فطری دائرہ کار سے باہر ہوجاتی ہے۔

تیری تصویر ہے مستقل سامنے
تیرے پیکر پہ میری نظر ہے غزل

تابش مہدی کا آخری مجموعہ کلام ’غزل خوانی نہیں جاتی‘ ہے۔ یہ شعری مجموعہ ان کے سفرِ غزل کا چھٹا پڑاؤ ہے۔ ان کے شاعری کے پچاس سالہ تجربات و مشاہدات کا عکس بھی اس میں نمایاں ہے۔ اس میں اگر ایک طرف اگر زلف و رخ کے قصیدے اپنے خصوصی پیکر میں نظر آتے ہیں تو وہیں ان کے اشعار کی روحانی فضائیں بھی خوشگوار جھونکوں کی طرح دھنشی رنگ میں نظر آتی ہیں۔

قندیل حسن بدر نے بڑا خوب صورت شعر کہا ہے۔

کورے کاغذ پہ بھی کاڑھے ہیں شجر، پھول، ثمر
شعر کہنا ہے تو کچھ ذائقہ کچھ ڈھنگ تراش

اس شعر کی روشنی میں ’غزل خوانی نہیں جاتی‘ کے چند اشعار نذر قارئین کرکے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

جب مجھ پہ عدو نے کی یلغار کبھی جاناں
تیری ہی محبت کو تلوار کیا ہے میں نے

جانِ حیات! نشانِ غزل! حسن آرزو!
دیکھا تجھے تو مجھ کو ثبوتِ خدا ملا

اک تصادم مستقل رہتا ہے حسن وعشق میں
آپ بیتی لب پہ لانے سے بھی شرماتا ہوں میں

غزل کا حسن ہی دار و مدار ہے لیکن
نظر نہ آیا کوئی آج تک غزل کی طرح

ملی اک پارسا کی جب سے صحبت
یہ دامن پاک ہوتا جارہا ہے

تابش مہدی اپنی فطری ذہانت اور ذکاوت کے باوصف اپنے عہد کے شاعروں میں ممتاز و ممیز رہے ہیں اور رہیں گے بلکہ جب ان کی غزلیہ شاعری کا باریک بینی اور ژرف نگاہی کے ساتھ مزید گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا تو گنجینۂ معانی کے کئی طلسمی دروازے کھلیں گے اور نئے انکشافات سامنے آئیں گے۔ انھوں نے کہا تھا۔

فلک کے اوج پہ یا تم زمین پر رہنا
جہاں بھی رہنا مقام اپنا دیکھ کر رہنا

■

Dr. Munawwar Hasan Kamal
N-93, Fourth Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Mob.: 9873819521
Email.: mh2kamal@gmail.com

ابوالبشر

ڈاکٹر تابش مہدی

ڈاکٹر تابش مہدی اردو زبان و ادب کا نمائندہ اور ایک معتبر حوالہ تھے۔ انھوں نے زندگی کا ہر لمحہ علم و ادب کے فروغ میں وقف کر دیا۔ تابش مہدی کی زندگی موجودہ علم کے شیدائیوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ ادبی کاوش کی بدولت ان کو بہت سے انعام و اعزاز سے نوازا گیا۔

تابش مہدی ایک علمی و ادبی گھرانے میں 3 جولائی 1951 کو پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش یوپی کا مشہور ضلع پرتاپ گڑھ ہے۔ اصل نام مہدی حسن اور پیار سے تابش کہتے تھے۔ والد رفیع الدین جو موضع رام دیو پٹی بڈھورہ ضلع پرتاپ گڑھ کے ساکن تھے۔ زراعت ان کا پیشہ تھا۔ تابش مہدی کی ولادت ننھیال میں ہوئی اور وہیں پرورش و پرداخت بھی ہوئی۔ ان کی شہرت قلمی نام 'تابش مہدی' سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ننھیال ہی میں گھریلو ماحول میں ہوئی۔ اس سلسلے کی وضاحت کرتے ہوئے شجاع الدین نے اپنی کتاب میں اس طرح لکھا ہے:

''تابش صاحب کی ننھیال کسی حد تک فارغ البال اور علم و عمل سے آشنا تھی۔ ان کے نانا حضرت صوفی میاں محمد ثابت علیؒ موضع ناجیہ پور ضلع پرتاپ گڑھ کے ساکن تھے۔ انھیں اپنے عہد کے مشہور بزرگ و مجاہد حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ سے شرف ارادت حاصل تھا۔ انھیں کے یہاں تابش نے اپنے دنیا میں آنے کا اعلان کیا اور وہیں شعور کی ابتدائی منزلیں بھی طے کیں۔''

(تابش مہدی ایک سفر مسلسل، ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، مولانا مبین الدین فاروقی اکادمی، حمزہ کالونی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ یوپی، 2013، ص 18)

تابش مہدی نے 1964 میں ڈسٹرک بورڈ پرتاپ گڑھ سے جونیئر پرائمری اسکول کا امتحان پاس کیا، 1965 میں مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے تجوید اور قرأت سیکھی۔ بعدازاں تعلیم انھوں نے تعلیم القرآن حسن پور، مرادآباد میں حاصل کی۔ 1970 میں انھوں نے عربی اور فارسی بورڈ الہ آباد سے مولوی (عربی)، 1978 میں منشی (فارسی) اور 1980 میں کامل (فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ 1989 میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی سند حاصل کی، بالآخر 1997 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے اردو تنقید میں پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

تابش مہدی ہمیشہ اپنے مشفق اساتذہ سے ملتے رہتے اور ان کی عزت کرتے۔ اسی طرح وہ اپنے شاگردوں کو بھی عزیز رکھتے اور شاگردوں نے بھی ان کی اسی طرح عزت کی۔ تابش مہدی کے اہم اساتذہ میں مشہور شاعر اور طنز و مزاح کے اکبر ثانی شہباز امروہوی، بلالی علی آبادی یہ بھی اپنے وقت کے اہم شاعر اور بلند پایہ استاد تھے، آرزو لکھنوی کے شاگرد سروش مچھلی شہری جو کہ تابش مہدی کے لائق و فائق استاد تھے، ابوالوفا عارف شاہ جہاں پوری اور شاعر عامر عثمانی دیوبندی شامل ہیں۔ اپنے ان اساتذہ کا ہمیشہ ذکر خیر کرتے۔ ان کا سکھایا ہوا درس اور نصیحتوں کو گرہ سے باندھ رکھا تھا۔

تابش مہدی کا نکاح 18 مئی 1979 میں دیوبند کے مشہور خطاط اشتیاق احمد عثمانی کی پوتی اور ممتاز احمد عثمانی کی بیٹی رضیہ عثمانی سے ہوا۔ شریک حیات سے ان کی سات اولادیں ہیں۔ دو فرزند 'شاہ دانش فاروق فلاحی، شاہ اجمل فاروق ندوی کے علاوہ چار بیٹیاں جن میں ثمینہ تابش صالحاتی، طوبیٰ کوثر صالحاتی، یمنیٰ کلثوم اور نعمیٰ کلثوم ہیں۔

تابش مہدی نے اپنی تدریسی و عملی زندگی کا آغاز 1971 سے کر دیا تھا۔ معاشی حالات نے باقاعدگی سے اسکولی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی وجہ سے وہ معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے کم عمری میں تگ و دو میں منہمک ہوگئے۔ انھوں نے پرتاپ گڑھ کے کالج 'ابوالکلام آزاد' سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور 1971 سے 1973 تک منسلک رہے۔ جنوری 1974 سے جون 1978 تک دارالعلوم امروہہ میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد دیوبند میں منسلک رہے دیوبند کے بعد آپ نے جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ میں مدرسی اختیار کی۔ آپ کی وفات 74 سال کی عمر میں 22 جنوری 2025 کو صبح 10 بجے دہلی کے میکس ہاسپٹل میں ہوئی جہاں یہ گردے اور دل کی بیماریوں کے علاج کے لیے ایڈمٹ تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تابش مہدی تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ صحافتی اداروں سے وابستہ رہے جن کا مختصراً ذکر بھی ضروری ہے۔ مختلف اوقات میں پندرہ روزہ 'پیغام حق' پرتاپ گڑھ سے نکلتا تھا اس سے منسلک رہے۔ دیوبند سے پندرہ روزہ 'اجتماع' نکلتا تھا اس سے جڑے۔ ماہنامہ 'الایمان' جو دیوبند سے ہی نکلتا تھا اس کے مدیر تھے۔ ماہنامہ 'گل گڑھ' سہسوان (بدایوں) سے جاری ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر رہے۔ ماہنامہ 'ذکریٰ' جو رامپور

سے شائع ہوتا تھا اس سے آپ منسلک رہے۔ ماہنامہ 'تجلّی' یہ دیوبند سے جاری ہوا اس سے بھی وابستہ تھے۔ دہلی سے جاری ہونے والا 'زندگی نو' سے جڑے۔ دہلی اردو اکیڈمی سے شائع ہونے والا رسالہ 'ایوان اردو' کے معاون مدیر بھی رہے۔ اپریل 2002 اور جنوری 2005 سے بالترتیب ماہنامہ 'پیش رفت' (دہلی) کے رکن مجلس ادارت اور سہ ماہی 'کاروانِ ادب' (لکھنؤ) کے مشیر اعزازی اور مجلس ادارت کے رکن تھے۔ یہ تابش مہدی کی صحافتی سچائی تھی جو مختصراً بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں اور ادبی اداروں سے جو وابستگی تھی اس کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگا۔

تابش مہدی 1991 سے 3 جولائی 2009 تک مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی میں بطور ایڈیٹر اپنی خدمات انجام دیں۔ آپ مادر علمی ابوالکلام آزاد انٹر کالج (پرتاپ گڑھ) اور ادارۂ ادب اسلامی ہند کے رکن اساسی بھی تھے۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی (ہند) اور دارالدعوۃ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن (دہلی) کے ممبر، ادبیات عالیہ اکادمی لکھنؤ کے چیئرمین، ادارۂ ادب اسلامی ہند کے سابق نائب صدر، سہ ماہی 'کاروانِ ادب لکھنؤ' کے رکن ادارت بھی تھے۔ یہ تمام ذمہ داریاں تابش مہدی کو مفت میں تفویض نہیں کی گئی تھیں بلکہ ان کی اہلیت وصلاحیت اور کارکردگی کو دیکھتے ہوئے دی گئیں تھیں جس پر آپ کھرے اترے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی اردو ادب کے لیے صرف کردی، چاہے وہ شاعری کے حوالے سے یا نثر، یعنی اپنی تنقیدی و تحقیقی خدمات کے حوالے سے ہی ہو۔ تابش مہدی کی تصنیفی کاوش میں 55 کتابیں ہیں جن میں 13 شاعری کے مجموعے ہیں۔ شاعری کے مجموعے میں ان کے 6 نعتوں اور منقبتوں کے مجموعے ہیں جو کہ ایک بہترین کارنامہ ہے۔

شعری مجموعوں کے نام نقش اول (1971)، لمحات حرم (1975)، سرور حجاز (1977)، تعبیر (1989)، سلسبیل (2000)، کنکر بولتے ہیں (2005)، صبح صادق (2008)، طوبیٰ (2012)، غزل نامہ (2011)، مشک غزالاں (2014)، رحمت تام (2018)، غزل خوانی نہیں جاتی (2020)، دانائے سبل (2023)

ڈاکٹر تابش مہدی کثیر الجہات شخصیت کے مالک اور اعلیٰ درجے کے شاعر، ناقد، محقق، اسلامی اسکالر بھی تھے۔ آپ انتہائی ملنسار، دوستوں کے سچے دوست اور نئے نئے دوست بنانے، ان سے تعلقات استوار رکھنے میں ماہر تھے۔ مہدی کو شاعری کے ساتھ ساتھ علم عروض وقوافی میں مہارت حاصل تھی۔ آپ ان صدہا شخصیات میں سے ایک تھے جو اپنے نامساعد حالات میں بھی اپنی تعلیمی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکے اور معاشی مجبوریاں بھی تعلیمی ترقی میں خلل نہ پیدا کر سکیں۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو ذوق وشوق اور عزم جواں لیے ہوئے شاہ راہ علم پر سرپٹ دوڑتے ہوئے منزل مقصود پر بآسانی بھلے ہی نہ پہنچ پائے لیکن سنگلاخ زمینوں کو ہموار کرتے ہوئے بالواسطہ طریقوں سے منزل مقصود کو ضرور پالیتے ہیں۔

تابش مہدی محض ناقد، محقق، تاریخ نگار ہی نہیں تھے بلکہ شاعر اور مستند عالم بھی تھے۔ عربی، فارسی، ہندی اور اردو زبان پر ان کو دسترس حاصل تھا۔ پوربی، اودھی اور بھوجپوری ان کے گھر کی غلام تھی، فلسفہ کا انھوں نے مطالعہ بھی کیا، مذہبی تاریخ، اسرائیلیات اور بائبل سے خاصی واقفیت بھی تھی۔ غزلیہ شاعری اور نعتیہ مجموعے سے ان کی دینی علیت اور اس کی گہرائیوں کے عکس ان میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعے کلام کا مختصراً جائزہ لینا ضروری ہے۔

کنکر بولتے ہیں: یہ شعری مجموعہ ہے جو فریوائی اکادمی، شاہین باغ، جامعہ نگر نئی دہلی سے 2005 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی تقدیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی نے لکھی۔ اس میں ایک مضمون شامل ہے جس کا عنوان 'دیر تک زندہ رہنے والی شاعری' جو مخمور سعیدی کا لکھا ہوا ہے۔ تقدیم میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈاکٹر تابش مہدی ہمارے عہد کے ایک ممتاز و نامور ادیب، صاحب بصیرت و معتبر نقاد، ذہین و ژرف بین محقق اور کہنہ مشق، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ جہاں ایک اچھے اور بڑے ادیب، شاعر، تنقید نگار اور محقق کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، وہیں اعلیٰ انسانی واخلاقی قدروں کے نقیب و ترجمان کی حیثیت سے بھی ان کی اپنی ایک پہچان ہے۔ وہ اپنے فکر وفن کی یکسانی اور عقیدہ وعمل کی پختگی کی وجہ سے تمام حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا یہ شعر ان کی زندگی کے اسی رُخ کی نشان دہی کرتا ہے۔

اب عظمت وتوقیر جبیں جان لی میں نے
اب اور کسی در پہ مرا سر نہ ملے گا

(کنکرے بولتے ہیں، مجموعہ شاعری ص 11، تقدیم)

تابش مہدی شاعری میں اپنا ایک منفرد لب ولہجہ اور مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے سیدھے سادے لفظوں سے بڑے گہرے معانی ومفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کو اس ہنر میں مہارت بھی حاصل تھی۔ اسی کے ساتھ مخمور سعیدی کا مضمون جو اسی مجموعے میں شامل ہے۔ مخمور سعیدی کی رائے تابش مہدی کے متعلق پیش نظر ہے:

''ڈاکٹر تابش مہدی بہ طور شاعر بھی اور بہ حیثیت انسان بھی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں اسلامی اقدار کے سایے میں پروان چڑھی ہیں اور انھیں اقدار کے گہرے شعور نے ان کے فکر وخیال کو انسان دوستی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔''

صبح صادق: یہ تابش مہدی کا نعتیہ مجموعہ ہے جس میں حمد، نعت اور منقبت ہے۔ ویسے بھی ان کے تمام شعری

مجموعوں میں سے چھ نعتوں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے سے ان کی نعت گوئی کا اندازہ ہوگا۔ یہ مجموعہ ادبیات عالیہ اکادمی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 2008 میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں ’حرف چند‘ کے علاوہ بھی چار مضامین شامل ہیں۔’زائرِ حرم ثانی: تابش مہدی‘، ’ایک صحیح العقیدہ نعت گو‘،’حرف تحسین‘،’نمودِ صبح صادق‘ اہم ہیں۔حرف چند میں تابش مہدی نے اپنی نعت گوئی اور نعت کے سلسلے میں چند باتیں تحریر کیں ہیں:

’’صبح صادق، میری نعتیہ ومنقبتی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مجموعہ ’لمحاتِ حرم‘ کے نام سے دسمبر 1975 میں انجمن دائرۃ الفکر، دارالعلوم امروہہ کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کو میرے اساتذہ کرام طوطیِ ہند حضرت مولانا وفا عارف شاہ جہاں پوریؒ، حسان الہند علامہ بلالی علی آبادیؒ اور سلطان سخن علامہ شہباز صدیقی امروہویؒ کی دعائیں حاصل تھیں۔‘‘

(صبح صادق، تابش مہدی، ادبیات عالیہ اکادمی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 2008، ص 6)

تابش مہدی کے قلم نے نظم و نثر دونوں میں کمالات دکھائے ہیں۔جب اخبارات، رسائل، سیمیناروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہوکر کسی شاعر یا ادیب کے کلام یا نثری کاوشوں کا جائزہ پیش کرتے تو وہ ناقد، محقق کے روپ میں نظر آتے۔ تابش مہدی ہر شکل و صورت میں بھاری بھرکم و موثر نظر آتے تھے اسی وجہ سے ان کو ملک و بیرون ملک میں مدعو بھی کیا جاتا تھا۔ آپ کی شہرت ومقبولیت شاعر کی حیثیت سے ہے لیکن شعری سرمایے کے بالمقابل ان کی نثری کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اب ان کی نثری کاوشوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

اردو تنقید کا سفر- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں: یہ تابش مہدی کا باقاعدہ تنقیدی وتحقیقی کارنامہ ہے۔320 صفحات پر مشتمل یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے 1999 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کو آپ نے چار ابواب میں تقسیم کیا۔ پہلے باب میں اردو تنقید کی طویل تاریخ اور نقادوں کا تذکرہ شامل کیا ہے۔اس میں تنقید کے معنی ومفہوم، تنقید اور تنقید نگار، تنقید کے نظریے ،اردو تنقید کا قدیم دبستان، مارکسی، سماجی، سائنٹفک ،ترقی پسند تنقید،نفسیاتی تنقید، جمالیاتی تنقید، ہیئتی تنقید،اسلوبیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، تشریحی اور توضیحی تنقید، اردو تنقید کی روایت، تذکروں میں تنقید کی روایت، تذکرۂ نکات الشعرا، تذکرۂ ریختہ گویاں، مخزن نکات، تذکرہ شعرا اردو، تذکرہ ہندی، مجموعہ نغز، گلشن بے خار، آب حیات، حالی کی تنقید نگاری، شبلی کی تنقید نگاری، عبدالحق کی تنقید نگاری وغیرہ اہم ہیں۔

دوسرے باب میں جامعہ کا عام ادبی ماحول اور اردو تنقید کے ابتدائی نقوش 1947 سے پہلے، اس باب میں 23 علمی وادبی ہستیوں اور مختلف قسم کی علمی کتابوں سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کردیا۔

تابش مہدی کے قلم نے نظم و نثر دونوں میں کمالات دکھائے ہیں،جب اخبارات، رسائل، سیمیناروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہو کر کسی شاعر یا ادیب کے کلام یا نثری کاوشوں کا جائزہ پیش کرتے تو وہ ناقد، محقق کے روپ میں نظر آتے۔

باب سوم کا عنوان ہے’جامعہ میں اردو تنقید کی روایت 1947 کے بعد(پہلا دور)‘ اس میں سید عابد حسین، ذاکر حسین، محمد مجیب عبداللطیف اعظمی اور مسعود حسین خاں کو نقاد قرار دیا گیا ہے۔اس کے مطالعے سے قاری کو اندازہ ہوگا کہ کس کو نقاد مانا ہے اور کس کو نہیں۔

چوتھا باب’جامعہ میں ہم عصر تنقید (دوسرا دور)‘ اس باب میں وہاں کے شعبۂ اردو سے تعلق رکھنے والے چودہ اساتذہ کے نام بحیثیت نقاد لیا گیا ہے۔تنویر احمد علوی، شمس الرحمٰن محسنی، گوپی چند نارنگ، محمد ذاکر، مشیر الحق، منظر اعظمی، حنیف کیفی، عظیم الشان صدیقی، انور صدیقی، مظفر حنفی، شمیم حنفی، عنوان چشتی، صغریٰ مہدی اور قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی وغیرہ شامل ہیں۔

تابش مہدی نے تمام اصحاب کے ناموں کی ترتیب، تاریخ پیدائش کے اعتبار سے رکھی جو مشکل کام تھا۔ اس میں 90 مضامین قدیم وجدید شعرا وادبا پر ہے ان کے کلام اور تحریروں پر نقد وتبصرہ کیا گیا جن میں کچھ پر سرسری انداز اور کچھ پر ضرورت کے حساب سے تفصیل سے لکھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ جو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے تحریر کیا ہے انھوں نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے۔

’’جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حوالے سے ادبی تنقید کا تذکرہ بعض اوقات حیرت میں ڈال سکتا ہے، لیکن موجودہ کتاب کے مطالعے کے دوران نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تنقید کی روایت اور اس کے سفر سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ مختلف ادوار میں یہاں موجود اساتذہ کی انفرادی کوششوں پر بھی بھرپور اور غیر جانب دارانہ روشنی پڑتی ہے...... عام طور سے سہل الحصول اور پیش پا افتادہ موضوعات سے ہی سروکار رکھتے ہیں۔ تابش مہدی نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔انھوں نے بھاری پتھر کو صرف چوم کر چھوڑ دینے کے بجائے اس کے علمی، اخلاقی اور ادبی تقاضوں کو بڑی عمدگی سے پورا کیا ہے۔حد یہ ہے کہ زبان و بیان اور املا وانشا کے ادنیٰ تسامحات سے بھی ان کا یہ کارنامہ پاک ہے۔‘‘

(اردو تنقید کا سفر- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں، ڈاکٹر تابش مہدی، ادبیات عالیہ اکادمی، نئی دہلی 1999، ص 10)

تابش مہدی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نثر نگار بھی تھے۔وہ خوبصورت اور موثر زبان لکھنا جانتے تھے۔ ان کا اسلوب بیان متاثر کن تھا اور ان کی تحریریں اس چیز کی شاہد ہیں۔آپ ادب اسلامی کے عالم اور ترقی پسند تحریک وجدیدیت کے زبردست ناقد ومخالف تھے۔لیکن ان تحریکوں کے مثبت پہلوؤں کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔ان کو مختلف اکادمیوں کی طرف سے اعزازات و انعامات سے نوازا گیا یہاں چند کا ذکر ضروری ہے۔

حضرت حسان ایوارڈ، کل ہند حمد ونعت اکادمی، دہلی 2005،نشان اردو، اردو اکادمی نیپال 2013، راسخ عظیم آبادی ایوارڈ، بہار اردو اکیڈمی، 2013، ایوارڈ برائے خدمات اردو، اردو اکادمی دہلی 2015، علامہ اقبال عالمی ایوارڈ برائے شعر وادب، اردو ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن آف انڈیا، 2021۔

■

Abul Bashar
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:9358693234

عبدالرحمن فیصل

پروفیسر انور ظہیر انصاری

پروفیسر انور ظہیر انصاری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اردو کے اچھے استاد، ادب کے ایک سنجیدہ قاری اور ناقد کی حیثیت سے اردو ادب میں جانے جاتے ہیں۔ اب تک ان کی کل 12 کتابیں اور تقریباً 70 سے زائد مضامین ہندوستان کے مؤقر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ 90 سے زیادہ سمیناروں میں آپ نے شرکت کی اور مقالے پیش کیے ہیں۔ ادبی سرگرمیوں کے علاوہ تقریباً 40 ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں کے ممتحن اور 5 / پی ایچ ڈی کے مقالوں کے نگراں رہ چکے ہیں۔ تقریباً 41 توسیعی خطبے ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں آپ نے پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر بھی رہے ہیں۔ ساتھ ہی گجرات میں اردو زبان و ادب کے لیے جو خدمت انھوں نے کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری یکم اکتوبر 1953 کو اتر پردیش کے ضلع مئوناتھ بھنجن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مئو میں ہی حاصل کی بعد ازاں بی اے کی تعلیم گورکھپور یونیورسٹی سے مکمل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے جواہر لال یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم اے (1983)، ڈپلوما ان ماس کمیونیکیشن (1985) اور 1988 میں ایم۔فل کی سند حاصل کی۔ اردو کے نامور اساتذہ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر نصیر احمد خان، ڈاکٹر اشفاق محمد خان ان کے استاد تھے۔ جنھوں نے ان کے علمی و ادبی ذوق کو نکھارا۔ اس کے علاوہ جن اساتذہ سے انھوں نے استفادہ کیا ان میں پروفیسر نورالحسن انصاری (فارسی)، پروفیسر عبدالودود اظہر (فارسی)، پروفیسر قمر رئیس، تنویر احمد علوی، عنوان چشتی، شمیم حنفی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

کورونا کی وبا کے بعد ہی انور ظہیر صاحب کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ آخر کار 31 اکتوبر 2024 کو انھوں نے اس دیارِ فانی کو خیر باد کہہ دیا۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ نے ملازمت شروع کر دی تھی۔ 1984 تا 1985 تک دوردرشن کے رفرنس سیکشن میں آپ نے جزوی ملازمت کی۔ جنوری 1985 سے جون 1985 تک آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن کے زیر نگرانی یو جی سی پروجکٹ میں بحیثیتِ ریسرچ اسسٹنٹ وابستگی رہی۔ فروری 1986 میں ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ کے شعبۂ فارسی عربی اور اردو میں بحیثیتِ اردو لکچرر آپ کا تقرر ہوا اور ترقی کرتے ہوئے اکتوبر 2015 میں پروفیسر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری کی تنقیدی تحریروں کا سلسلہ تو 1980 سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ان کا پہلا مضمون 'دہلی اور فورٹ ولیم کالج کا تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے نومبر 1983 میں ماہنامہ 'ادب نکھار' مئوناتھ بھنجن سے شائع ہوا۔ 2004 میں ان کی پہلی کتاب 'ساحر لدھیانوی: حیات و کارنامے' کے عنوان سے ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ مقالہ انھوں نے پی ایچ ڈی کی سند کے لیے تحریر کیا تھا۔

جیسا کہ ذکر آیا ہے کہ اب تک ان کی متعدد کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں ترجمہ، ترتیب اور مضامین کے مجموعے شامل ہیں ان کی فہرست اس طرح ہے۔ شعورِ ادب (مضامین کا مجموعہ) 2007، ورق ورق آئینہ (ترتیب) 2009، اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث (تنقیدی مضامین) 2013، سرسید سے شہریار تک (تنقیدی مضامین) 2018، ترقی پسند شعر و ادب (تنقیدی مضامین) 2019، قصہ غمگین (ترجمہ اردو سے دیوناگری)۔

پروفیسر انصاری کی ساحر لدھیانوی کی ادبی خدمات پر شائع ہونے والی کتاب کی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی اور ادب کے ایک سنجیدہ قاری کے طور پر قارئین ادب و ناقدینِ ادب میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ یہ کتاب ساحر کی زندگی اور تخلیقی کارناموں پر مشتمل ایک مبسوط اور حوالہ جاتی مقالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے ساحر پر جو کچھ بھی مواد موجود تھا وہ مضامین کی شکل میں رسالوں میں تھا اور اس کے علاوہ ناز صدیقی کی کتاب ساحر لدھیانوی: شخص اور شاعر بھی ملتی ہے لیکن اس کتاب میں ساحر کے کارناموں کا صرف اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر انصاری کے مقالے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ساحر کی زندگی، شخصیت، شاعری اور فلمی نغموں پر شائع شدہ یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مقالہ نگار نے یہ مقالہ خود اپنی نگرانی میں ہی مکمل کیا۔ مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے خود کو صرف موضوعاتی تجزیہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ساحر کی فنی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے اور تقابلی مطالعے کے ذریعے ہم عصر شاعری میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پہلا باب ساحر کی حیات اور تخلیقی ارتقا سے متعلق ہے جس میں ساحر کی پیدائش، ابتدائی تعلیم وتربیت، ماحول جس میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی اور جس کا اثر ان کے کلام میں بھی جا بہ جا نظر آتا ہے، کا ذکر کیا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی باب میں پروفیسر انصاری نے یہ بھی بتایا ہے کہ ساحر کی شاعری کا سلسلہ کالج کے ہی زمانے سے شروع ہوگیا تھا اور ساحر اپنی جذباتی تقریروں اور انقلابی نظموں کے ذریعے عوام کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اسی حصے میں مصنف نے ساحر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، معاشقوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کا اثر کسی نہ کسی طرح ان کی شاعری پر پڑا اور بعض نظموں مثلاً نظم 'گریز' کے ذریعے مقالہ نگار نے ان کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ اسی باب میں ساحر کا بمبئی آنا، پھر باضابطہ طور پر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونا اور فلمی دنیا سے ان کی وابستگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کتاب کے چار ابواب مکمل طور پر ساحر کی شاعری کے حوالے سے قلم بند کیے گئے ہیں جس میں نظمیں، غزلیں، مرثیے اور ان کی فلمی شاعری شامل ہے۔

ان ابواب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے ساحر کے کلام کی تفہیم میں تجزیاتی طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ انھوں نے شاعر کے عہد اور اس کے ماحول کی روشنی میں بھی کلام کو دیکھنے کی کوشش کی ہے مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ساحر کی شاعری میں ایک ایسی فضا اور ایسا احساس نظر آئے گا جو ان کے نجی حالات اور ماحول اور اسی عہد کی سماجی و سیاسی اور فکری و تہذیبی تبدیلیوں سے اثر پذیر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر کی شاعری کا مطالعہ ہمیں اجتماعی زندگی کے ان تمام عوامل وعناصر سے ہم کنار کرتا ہے جس پر فرسودہ تہذیبی روایات و اقدار حیات اور استعماری قوتوں کے جبر واستحصال کی مہر ثبت ہے۔''1

ساحر کی شعری زندگی کا آغاز تقریباً ترقی پسند تحریک کے قیام کے ساتھ ہی ہوا یہ زمانہ ہندوستان میں جہدِ آزادی کا دورِ عروج تھا۔ ساحر نے حالات کے شکار آزادی سے محروم، مظلوم انسانوں کے تئیں ہمدردی کا رویہ اختیار کیا اور تذلیلِ انسانی کے خلاف صدائے

> پروفیسر انصاری کی ساحر لدھیانوی کی ادبی خدمات پر شائع ہونے والی کتاب کی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی اور ادب کے ایک سنجیدہ قاری کے طور پر قارئین ادب وناقدینِ ادب میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ یہ کتاب ساحر کی زندگی اور تخلیقی کارناموں پر مشتمل ایک مبسوط اور حوالہ جاتی مقالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

احتجاج بلند کی۔ ساحر کے یہاں اجتماعی زندگی کا پختہ شعور، قوتِ ارادی اور سیاسی وسماجی انقلاب کے واضح نقوش جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ساحر کے سامنے چوں کہ غلام ہندوستان کی غلام انسانیت تھی۔ سیاسی اور فکری آزادی سے محروم اور طبقاتی درجہ بندی کے سبب استحصال کا شکار۔ لہٰذا ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے ناتے انھوں نے نہ صرف معاشی بدحالی، سماجی ناانصافی، سیاسی غلامی اور معصوم عوام کو مذہب اور تہذیب کے نام پر تقسیم کرنے کے رجحان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ ایک ایسے سماجی نظام کے قیام کا احساس بھی بیدار کیا جس میں اخوت اور مساوات کو فروغ ہو اور انسان کو انسان کی طرح جینے کا حق واختیار حاصل ہو۔''2

مذکورہ اقتباس میں مستعمل لفظیات مثلاً طبقاتی درجہ بندی، استحصال و جبر کے خلاف صدائے احتجاج، معاشی بدحالی، سماجی ناانصافی، سیاسی غلامی وغیرہ، ترقی پسند تنقید نگاری کے کلیدی الفاظ ہیں۔ چونکہ ساحر ایک ترقی پسند شاعر تھے اس لیے ضروری بھی ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ اس عہد کی روشنی میں کیا جائے جس سے ان کے کلام کی معنویت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو پروفیسر انصاری ساحر کے کلام کی تفہیم وتجزیے میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

ساحر کی شاعری کے موضوعاتی تجزیے کے ساتھ ساتھ پروفیسر انصاری ان پس پردہ عوامل مثلاً سماجی، فکری وزندگی کی حقیقتوں، کا بیان بھی کرتے ہیں جن کے سبب ان کی شاعری میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

کلامِ ساحر کے موضوعی وفکری تجزیے کے بعد انھوں نے تقریباً ہر باب کے آخر میں ان کے فن سے بھی بحث کی ہے، جس میں ہیئتی نظام کو پیش نظر رکھا ہے، خصوصاً علمِ بیان وبدیع کے حوالے سے شاعری کی مثالیں پیش کر کے پروفیسر انصاری نے جمالیاتی خوبیوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ ساحر کی فنی خوبیوں میں انھوں نے نظموں میں مستعمل محاکات نگاری کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جس کے ذریعے ساحر نے اپنی نظموں کو ڈرامائی شکل عطا کی ہے۔ اس حوالے سے ان کا یہ اقتباس دیکھیں:

''پرچھائیاں محاکات نگاری کا بہترین نمونہ ہے جس میں فلمی مونتاژ کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے پیکر سازی کی اس نئی صورت نے غیر مرئی اور ساکت و جامد چیزوں کو بھی زندہ اور متحرک کر دیا ہے۔ پرچھائیاں درحقیقت ایک تصویری سلسلہ ہے جو تصورات کی پرچھائیوں کے ساتھ ابھرتا اور ڈوبتا رہتا ہے اور یہ عمل پوری نظم میں اپنے ڈرامائی عنصر کے ساتھ جاری وساری ہے''3

اس اقتباس کے بعد پروفیسر انصاری نے نظم کا مکمل متن پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نظم کا بنیادی حسن صرف اس کا موضوع نہیں جو عالمی امن کے قیام کی آرزوؤں سے اثر پذیر ہوا ہے بلکہ وہ فنی رچاؤ اور فنکارانہ حسن ہے جو زبان کی سادگی اور بیان کی دلکشی کے سبب دوچند ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اس لحاظ سے بھی تنہا نظم ہے کہ یہ مختلف بحروں میں لکھی گئی ہے اور تمام بحروں میں مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال بھی اس کے فن کو نکھارتا ہے۔''4

مذکورہ بیانات کو اگر ذہن میں رکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر انور ظہیر انصاری کا شعری شعور پختہ ہے۔ لیکن اس تجزیے میں اگر وہ متن کی close reading کے ذریعے یہ بھی دکھاتے کہ کس طرح مضمون کی رعایت

سے مناسب لفظوں کا استعمال اور محاکات نگاری نظم کو ڈرامائی حیثیت عطا کرتی ہیں اور وہ کون سے عناصر ہیں جو نظم میں مستعمل غیر مرئی اشیا کو زندہ اور متحرک کر دیتے ہیں تو ان کا تجزیہ زیادہ منطقی اور معروضی ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر انصاری نے حتی الامکان اپنی بات دلائل وشواہد کی روشنی میں پیش کی ہے اور نظم کی معنویت کو فکری وفنی دونوں حوالوں سے روشن کیا ہے۔

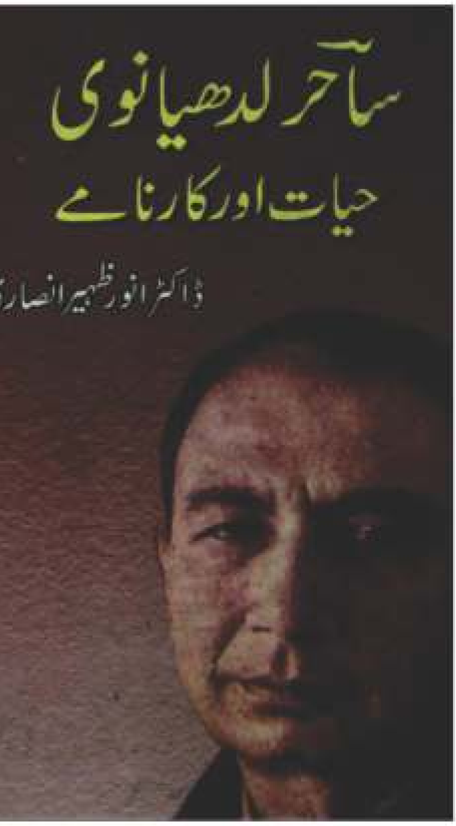

غزل اور فلمی شاعری کے باب میں مصنف نے موضوعی اور فنی تجزیے کے ساتھ ساتھ ہم عصر شعرا اور نغمہ نگاروں کے تقابل کے ذریعے ساحر کی شاعری پر ان کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان کی بلند قامتی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

ساحر کی فلمی شاعری کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ''ساحر نے ابتداً لفظیات اور اسلوب کی انفرادیت کے باوصف اپنے ماقبل شعرا مثلاً مجروح، جانثار اختر وغیرہ کی روایت سے ہی استفادہ کیا ہے لیکن اس منزل میں بھی ان کے نظریات رہنما بنے رہے''5

مجروح اور ساحر کے اولین نغموں کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ مجروح نے وارداتِ عشق کے بیان میں غزل کی رمزیت اور ایمائیت سے کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ساحر کا شعری رویہ نظمیاتی خصوصیات سے مستحکم ہوا ہے اور قنوطیت کے بجائے کرب آمیز نشاط کا احساس غالب آیا ہے۔

اسی باب میں آگے چل کر پروفیسر انور ظہیر انصاری نے ساحر کے نغموں کی ادبیت کا بھی مطالعہ شاعری کے تنقیدی Tools (نغموں میں مستعمل بیان و بدیع کی روشنی) کے حوالے سے کیا ہے اور ماقبل تنقید نگاروں کا حوالہ بھی پیش کیا ہے جنھوں نے ساحر کے نغموں کی ادبیت کو تسلیم کیا ہے۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک اور نظریے کی باز آفرینی میں معاون بھی ہے اور مطالعۂ ساحر کے باب میں نئے در وا کرتی ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری کی ایک اور کتاب 'ترقی پسند شعر و ادب' کے نام سے 2019 میں شائع ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کتاب ایک مخصوص نقطۂ نظر کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔

یہ کتاب 12 مضامین پر مشتمل ایک تنقیدی مجموعہ ہے، جو ترقی پسند نظریے اور اس تحریک کے معروف تخلیق کاروں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون 'ترقی پسند شعر و ادب' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں مصنف نے ترقی پسندی کے اس بنیادی نظریہ ''ادب زندگی اور سماج کا آئینہ ہونا چاہیے'' کی وضاحت پیش کی ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر انصاری نے اس زمانے کے تمام موضوعات کو شعرا و اُدبا کے تخلیقی وتنقیدی کارناموں کی روشنی میں پیش کر کے ترقی پسند شعر و ادب کی اہمیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اگر دیکھیں تو اس مضمون کو مجموعے کے مقدمے کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد تین مضمون علی سردار جعفری کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سردار جعفری کے ایک مضمون لمحوں کے چراغ (موت و زندگی کے آئینے میں) کے ذریعے پروفیسر انصاری نے سردار جعفری کے یہاں تصورِ زمان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ موت اور زندگی کے حوالے سے سردار جعفری نے وقت کو سمجھنے کے لیے اپنے پیش رووں مثلاً مولانا روم، علامہ اقبال، ٹیگور اور کبیر وغیرہ، کے تصورات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کا بیان کیا ہے۔ مصنف ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انھوں نے اس حوالے سے کئی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جن میں میرا سفر، زندگی اور موت، نئی دنیا کو سلام وغیرہ اہم ہیں۔ پروفیسر انصاری مضمون کا تجزیہ کرتے ہوئے آخر میں تصورِ وقت کے حوالے سے سردار کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ''زندگی اور موت کا ازلی رشتہ ارتقا پذیر ہے جو وقت کے دھارے پر بہتا چلا جاتا ہے، زندگی ختم ہوتی ہے اور ایک نئی زندگی وجود پذیر ہوتی ہے۔''6

سردار جعفری پر آخری مضمون ان کی غزلوں کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے، جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ سردار نے اردو غزل کو نہ صرف ترقی پسند موضوعات سے بہرہ ور کیا بلکہ لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے تہ دار بھی بنایا ہے اور نظموں کی لفظیات کو غزل کے پیکر میں پیش کر کے اسے غزل کے لب و لہجے سے ہم آہنگ بھی کیا ہے۔

ایک مضمون عزیز احمد کی کتاب 'ترقی پسند ادب' کے مطالعے پر بھی مبنی ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر انصاری نے ان کے نظریۂ نقد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی روشنی میں عزیز احمد کے ترقی پسند نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عزیز احمد نے مارکسی نظریات کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ مشرق و مغرب کے فلسفوں کے تناظر میں خصوصاً علامہ اقبال کے حوالے سے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔

> ساحر نے ابتداً لفظیات اور اسلوب کی انفرادیت کے باوصف اپنے ماقبل شعرا مثلاً مجروح، جانثار اختر وغیرہ کی روایت سے ہی استفادہ کیا ہے لیکن اس منزل میں بھی ان کے نظریات رہنما بنے رہے۔

فیض کی شاعری کے متعلق پروفیسر انور ظہیر انصاری لکھتے ہیں کہ فیض کی شاعری میں جذبے کی شدت کے باوجود نعرہ بازی نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ انھیں احتجاج و التفات کا شاعر کہتے ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے ان کی شاعری سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''فیض کی شاعری ملکی حالات و ماحول سے ہی اثر پذیر نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں عالمی مسائل سے پیدا شدہ خطرات کا احساس بھی شدید ہے۔ فیض کی شعری کائنات اسی لیے ہر دور کا احاطہ کر لیتی ہے، خواہ وہ مجاہدینِ فلسطین کے ترانے کی شکل میں ہو یا کربلائے بیروت کے نغمے کی صورت یا پھر تارکینِ وطن کے لیے نغمے کے ذریعے احتجاج اور التفات، فیض کا مقصدِ حیات تھا اور وہ تاحیات اس پر عمل پیرا بھی رہے۔''7

اسرار الحق مجاز ترقی پسند شعرا کی ابتدائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جعفر علی خان اثر نے انھیں اردو شاعری کا کیٹس کہا ہے۔ پروفیسر انصاری نے مجاز کو ارمانوں اور مسرتوں کا شاعر قرار دیا ہے اور ان کی شاعری کو ترقی پسند نظریے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجاز کی شاعری ارمانوں، مسرتوں اور زندگی کی توانائیوں کا جذبہ بیدار کرتی ہے اور انسانوں کے دکھ درد کا مداوا بھی تلاش کرتی ہے اس لیے مجاز کی شاعری ایک جینوئن ترقی پسند فنکار کی تخلیق ہے جو انسانوں میں امید اور آرزوؤں کا احساس جگاتا ہے۔

معین احسن جذبی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے جذبی کو نشاطِ درد کا شاعر قرار دیا ہے۔ انور ظہیر انصاری نے جذبی کی غزلوں اور نظموں دونوں کا مطالعہ اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جذبی کی شاعری میں روایت سے حقیقت تک کا ارتقائی سفر نظر آتا ہے۔ اگر ہم دیکھیں تو جذبی کی شاعری ان کی زندگی و حالات کی مکمل داستان بن گئی ہے۔ جذبی کے فن کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ جذبی نے کلاسیکی غزل کی لفظیات کو اپنی فن کاری کے ذریعے نئے معنی و مفاہیم عطا کیے ہیں جس کے سبب ان کے کلام میں چیخ و پکار کم اور خوش آہنگ طرزِ اظہار زیادہ ہے۔

جاں نثار اختر نے کافی عرصے تک ساحر لدھیانوی کے معاون کے طور پر فلم نگری میں جد و جہد کی اور زندگی کے تلخ و ترش برداشت کیے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بھی طبقاتی آویزش، سماجی ناہمواری اور استحصالی رویوں کے خلاف احتجاج کا ایک دھیما لہجہ پایا جاتا ہے۔ پروفیسر انصاری نے اس مضمون میں جاں نثار اختر کی زندگی، شخصیت، شاعری اور فلمی نغمہ نگاری کے ذریعے ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جاں نثار کا شعری کینوس بہت وسیع ہے.....ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے انھوں نے انسانوں کی قدر کرنے اور انسان کو انسان سمجھنے کا جذبہ بھی جگایا ہے۔ ایک صالح اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کی خاطر اس احساس کو بیدار بھی کیا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کے حوصلوں کو مہمیز بھی کیا ہے.....شہری زندگی کی گہما گہمی اور چکا چوند سے دور ایک ایسی زندگی کا احساس جو زندگی کے حسن سے معمور تو ہو اور حسن و جمال کی کیفیت سے بھرپور اور رومانیت سے لبریز بھی ہو، جاں نثار اختر کے یہاں جلوہ گر ہو گیا ہے۔''8

> **پروفیسر انورظہیر انصاری کا طریقۂ نقد تجزیاتی ہے وہ متن کا مطالعہ موضوعاتی اور فنی دونوں حوالوں سے کرتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ دلائل و شواہد کو وہ اپنی تحریروں میں وثوق اور قطعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر انصاری کی یہ کتابیں ترقی پسندی کی اس روایت کی باز آفرینی میں معاون ہیں جس کی مستحکم بنیاد پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس وغیرہ نے رکھی تھی۔**

کیفی اعظمی کو پروفیسر انصاری نے ایک بے باک کمیونسٹ شاعر کہا ہے۔ سردار جعفری انھیں اپنے ساتھ بمبئی لے کر آئے جہاں کیفی باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر بن گئے۔ کیفی کی نظموں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ کیفی کی زیادہ تر نظمیں ان کے ذاتی تجربوں و مشاہدوں پر مبنی ہے فٹ پاتھ، زندگی، مکان، دوپہر، آوارہ سجدے یا بہروپنی جیسی نظمیں بغیر تجربے و مشاہدے کے شاید ہی لکھی جا سکیں۔

اس کے علاوہ ایک مضمون مجروح کی فلمی نغمہ نگاری کے حوالے سے شامل ہے۔ پروفیسر انصاری لکھتے ہیں کہ مجروح نے اپنی غزلوں کی طرح فلموں میں بھی ترقی پسند خیالات کی ترجمانی کی ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''1956 کی کامیاب ترین میوزیکل جاسوسی فلم 'سی آئی ڈی' کے نغمے منظرِ عام پر آئے تو ایسے اٹھے کہ سب کی زبان پر چڑھ گئے اس کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس فلم کا مشہور زمانہ گیت، جو بہ ظاہر جانی واکر پر فلمایا گیا مزاحیہ نغمہ ہے لیکن مجروح نے اس گیت میں بھی اپنے ترقی پسند نظریات کی پیش کش کی راہ ضرور تلاش کر لی۔''9

پروفیسر انصاری کی اس کتاب کے مطالعے سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے تمام شعرا کا مطالعہ ترقی پسند ادب کی روشنی میں کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہر شاعر کے حالات زندگی کو بھی اپنے پیشِ نظر رکھا ہے اور اس سے شعرا کے کلام میں آنے والی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

مذکورہ تمام مباحث کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پروفیسر انور ظہیر انصاری کا طریقۂ نقد تجزیاتی ہے وہ متن کا مطالعہ موضوعاتی اور فنی دونوں حوالوں سے کرتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ دلائل و شواہد کو وہ اپنی تحریروں میں وثوق اور قطعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر انصاری کی یہ کتابیں ترقی پسندی کی اس روایت کی باز آفرینی میں معاون ہیں جس کی مستحکم بنیاد پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس وغیرہ نے رکھی تھی۔

حواشی:

1 ساحر لدھیانوی: حیات اور کارنامے، ص 43
2 ایضاً، ص 69
3 ایضاً، ص 94
4 ایضاً، ص 95
5 ایضاً، ص 176
6 ترقی پسند شعر و ادب، ایم آر پبلیکیشنز، 2019، ص 77
7 ایضاً، ص 135
8 ایضاً، ص 202-03
9 ایضاً، ص 231

■

Abdur Rahman
Assistant Professor, Dept of Urdu
ADC University of Allahabad- 211003 (UP)
Mob.: 8218467664
abdurrahmankhann@gmail.com

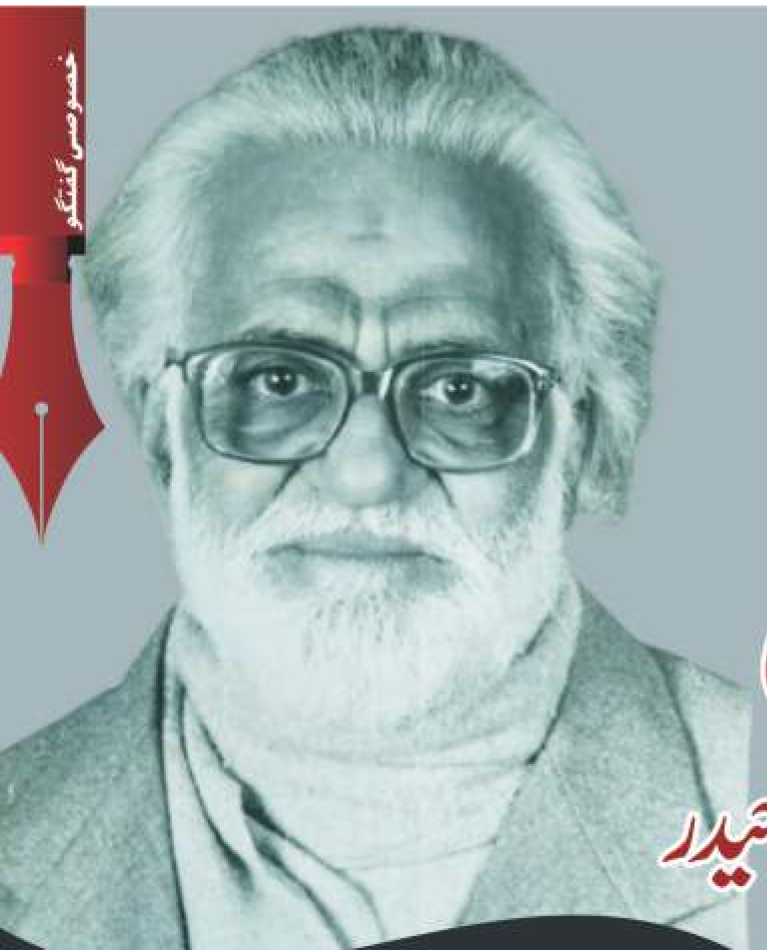

ساجد جلال پوری

بچّوں کے ادب میں سماجی، تکنیکی اور ماحولیاتی مواد کی ضرورت ہے: غلام حیدر

شہر امروهه مغربی اترپردیش کا قدیمی علمی، ادبی و تهذیبی شہر ہے۔ جہاں مصحفی، نسیم امروهوی، جون ایلیا، رئیس امروهوی، صادقین، کمال امروهوی، زبیر رضوی، خلیق احمد نظامی، عظیم امروهوی وغیرہ ایک سے بڑھ کر ایک شخصیتیں ماضی میں گزری ہیں۔ عهد حاضر میں بھی یہاں کے مختلف ستارے آسمان علم و ادب پر چمک رہے ہیں۔ انهیں میں نهایت بزرگ شخصیت سید غلام حیدر نقوی جو ادبی دنیا میں 'غلام حیدر' کے نام سے مشهور ہیں۔ انهوں نے ادب، مذهب، تنقید، تحقیق، ترجمه، ادب عالیه، ادب اطفال، کسی بھی میدان کو تشنه نهیں چھوڑا۔ اور تین درجن کے قریب کتابیں لکھیں۔ 88 سال کی عمرمیں ضعیفی و بیماری کے باوجود آج بھی مختلف اصناف سخن کو اپنے قلم کی روشنائی سے روشن کررہے ہیں۔ ادب اطفال پر انهوں نے اتنا زیادہ کام کیا ہے که وہ اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہیں۔ ان کی خدمات کے ارباب ادب و سیاست سبھی معترف ہیں۔ ان کی کتاب 'آخری چوری' کو 2010 میں ادب اطفال پر ساهتیه اکادمی کا اعزاز ملا ہے۔

ساجد جلال پوری: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

غلام حیدر: میری پیدائش یکم جنوری 1937، امروہہ (اس وقت ضلع مرادآباد کی تحصیل) میں ہوئی۔

س ج: آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟

غ ح: تیرھویں صدی عیسوی سے امروہہ میں حضرت سید شرف الدین شاہ ولایت کا نقوی خاندان امروہہ میں آباد ہے۔ والد سید غلام احمد گو کہ جدید اسکولی تعلیمی نظام میں کبھی نہیں پڑھے مگر نظم و نثر دونوں کی کافی مہارت تھی۔ چار کتابیں سماجی موضوعات (خواتین) اور ایک دینی اصلاحی کتاب 'پنجتنی پھول' 1939 سے برابر شائع ہورہی ہے۔

س ج: آپ کی تعلیم و تربیت کن کن شہروں میں ہوئی؟

غ ح: والد کی زیرِ نگرانی اسماعیل میرٹھی کی پانچوں ریڈرس کی تعلیم۔ منصبیہ کالج (میرٹھ) کی کسی ابتدائی جماعت میں ایک ڈیڑھ سال اردو فارسی کی تعلیم کی ابتدا 1943-44 چوتھی سے دسویں جماعت (میٹریکولیشن) جامعہ ملیہ اسلامیہ (1944-51) بی اے، ایم اے (معاشیات) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (1951-57)۔

س ج: آپ کے ادبی سفر کی ابتدا کیسے ہوئی؟

غ ح: جامعہ میں بچوں کے ادب کی تخلیقی صلاحیت کی آبیاری لگ بھگ ابتدائی جماعتوں سے ہی ہو جاتی تھی۔ پہلی کاوش ایک نظم 1944-45 میں 'پیام تعلیم' میں چھپی تھی۔ اسی رسالے میں 1970 تک میری کئی کاوشیں شائع ہوتی رہیں۔ پیامِ تعلیم کے مدیر (جو بچوں کے مانے جانے ہوئے ادیب ہوتے تھے) ان کا میں انتہائی مرہونِ احسان ہوں کہ انھوں نے تربیت و اصلاح کے قابلِ قدر فرائض انجام دیے۔

س ج: کیا نثر نگاری کے علاوہ آپ کو شاعری سے بھی ربط رہا ہے؟

غ ح: گو کہ بزعم خود میرا خیال ہے کہ میری پوری زندگی میں شعروشاعری کے اثرات غیر معمولی طور پر حاوی ہیں۔ جتنے اردو فارسی اشعار اب بھی مجھے یاد ہیں ان کا شمار کئی ہزار میں آتا ہے۔ مرجبہ دیوانِ غالب اب بھی آدھے سے زیادہ یاد ہے وغیرہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹ یونین کے الیکشن کے سلسلے کی 267 اشعار پر مشتمل مثنوی جسے کلاسک میں شمار کرکے انگریزی ریویو کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا گیا۔ بہرطور بقولِ غالب 'نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد' میں نے شاعری کے سلسلے میں اپنی ذہنی اور قلبی کیفیت کو اپنے شعر میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر خوانی سے نہیں کسبِ ہنر کی خواہش
سانس آجائے ہے رک رک کے کچھ اشعار کے ساتھ

بہرطور اپنے خیال میں کچھ زیادہ مفید یا کارآمد کام کرنے کی خواہش کے تحت طے کرکے اسے خیرآباد کہہ دیا تھا۔ اگر میرا یہ بیان کسی رخ سے آپ کے ناگوارِ خاطر ہوا ہو تو غالب کے اس شعر میں حسبِ ضرورت ترمیم کرکے اس طرح پڑھ لیجیے۔

بک رہا ہے جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

س ج: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی؟

غ ح: ایک نظم 'ایک دن کا قصہ' میں ساؤں' پیامِ تعلیم میں 1944 میں شائع ہوئی تھی۔ میرا تخلص احسن تھا۔ مقطع اس طرح تھا۔

احسن اب ایسا نہیں کرنا
مل تو گیا اس دن ہی بدلا

س ج: آپ کی تصانیف کی تعداد کیا ہے، ان کے نام بتائیں؟

غ ح: (ادب اطفال پر مطبوعہ کتابیں)

(1) پیسے کی کہانی (2) خط کی کہانی (3) بینک کی کہانی (4) اخبار کی کہانی (5) غار سے جھونپڑی تک (6) آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی (7) مولانا ابوالکلام آزاد (8) شیطانی مشین (9) پگڈنڈی جنگل سے کھیت تک (10) چار سہیلیوں کی کیاری (11) وقت کا مسافر (12) ایس۔ اے بریلوی (13) آخری چوری (ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ) (14) میرے استاد (15) پیڑ پیڑ میرا دانا دے (16) امید کی کرن (17) متفرق کہانیاں (18) مضامیں، مقالے اور متفرق تحریریں

(ادب عالیہ پر مطبوعہ کتابیں)

> جامعہ قدیم اردو میں بچوں کے جدید ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلکہ حقیقت میں بچوں کے ادب کو ایک اہم صنفِ ادب کا تصور جامعہ نے ہی بخشا ہے۔

(1) ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن کا فروغ (2) اماوس سے پورن ماسی تک (3) کتاب نما خصوصی شمارہ۔ انیس نمبر، ایڈیٹر) (4) نقوشِ جامعہ (5) کشکولِ حیدری (6) یوروپی ادب کی نادر کہانیاں (7) رو میں ہے رخشِ عمر (8) میری دو درس گاہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ (9) میری دو درس گاہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (10) اپنی دنیا آپ پیدا کر (خودنوشت) (11) قرآن حکیم اور اسلامی معاشرے کے بنیادی نقوش۔

س ج: بچوں کے ادب میں دلچسپی کیسے ہوئی۔ اس کا آغاز کیسے ہوا؟

غ ح: جامعہ قدیم اردو میں بچوں کے جدید ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلکہ حقیقت میں بچوں کے ادب کو ایک اہم صنفِ ادب کا تصور جامعہ نے ہی بخشا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ کے کارکنوں کی ایک پوری ٹیم، مکتبہ جامعہ، پیامِ تعلیم وغیرہ جامعہ کے دورِ فقیری میں بھی اس کام میں پورے انہماک سے لگے رہے اور نتیجے میں 1926 سے 1947 تک 300 سے زیادہ بچوں کی کتابیں مکتبہ جامعہ شائع کر چکا تھا۔ جن میں آدھے سے زیادہ جدید ترین سائنسی، تکنیکی اور سماجی موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہی بچوں کے ادب کے سلسلے میں میری نرسری تھی۔ خدا معلوم میں کتنا حق ادا کر پایا اپنی مادری درس گاہ کی توقع اور تربیت و تعلیم کا۔ ممکن ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ مزید تفصیل کے لیے میری تازہ نثری کلیات ''بچوں کا گلدستہ'' ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

س ج: ادب اطفال کے ماضی حال اور مستقبل پر تبصرہ فرمائیں۔

غ ح: بچوں کے اردو ادب کے سرمائے میں حصہ نظم بھرپور بلکہ آج کے تناظر اور میرے طرزِ فکر میں ادب کے تعمیری رخ کے اعتبار سے تناسب سے کچھ زیادہ ہے۔

اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، شفیع الدین نیّر جیسے کل وقتی اور متاثر کن شعرا بھی اب کم ہی ہیں۔ دوسرے نظم بہ مقابلہ نثر (بہ استثناء اسماعیل میرٹھی) بچوں کے لیے بہرطور محدود اظہار بیان کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ماضی کا نثری ادب (بہ استثناء مکتبہ جامعہ) میری رائے میں بڑی حد تک پرانی کہانیوں اور غیر منقول تصورات پر مبنی ہے اور جدید دور میں شامل ہونے والے بچوں کے لیے آج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

2 کچھ ادیب حسبِ ضرورت محنت کرکے صحیح معلومات کی فراہمی کے ساتھ بچوں کی مناسبت سے زبان و بیان وغیرہ کی پابندیوں کے ساتھ کوشش ضرور کر رہے ہیں، مگر میرے خیال میں وہ موجودہ طوفانی رفتار سے بدلتی ہوئی دنیا کے قارئین کی ذہن سازی کے لیے ناکافی ہے۔ زیادہ تر اشاعتی ادارے تجارتی مجبوریوں کے تحت اور اردو کے مجموعی زوال کے تحت قوتِ خرید میں شدید کمی کی وجہ سے بھی مجبور و معذور ہیں۔

3 ایک بنیادی اہمیت کا نکتہ یہ بھی ہے بچوں کا اردو ادب ہندوستان میں ایک غیر معمولی دور سے گزر رہا ہے۔ اس کے قارئین خود اپنے ہی ملک میں ہی مختلف تعلیمی اور معاشی طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم یافتہ خصوصاً اقتصادی آسودگی والا طبقہ اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر انگلش میڈیم اسکولوں میں بھیجتا ہے۔ مذکورہ اس طبقے کے لیے وجود و عدم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے نچلا یا اوسط طبقہ، جو بچوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیج سکتا وہ مجبوراً انہیں سرکاری اسکولوں میں بھیجتا ہے جہاں زیادہ تر ہندی یا علاقائی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ (اور علاقائی زبانوں سے ان کا بچوں کا ادب نہ صرف ان کے ذہنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، دیدہ زیب اور سستا بھی ہوتا ہے چونکہ اسے علاقے کی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ جن ریاستوں میں قانونی طور پر اردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے، وہاں (میری معلومات کے مطابق) کشمیر اور مہاراشٹر کے اردو میڈیم اسکولوں کے بچے ضرور موجودہ ادب اطفال کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔

گو کہ باقاعدہ اور مصدقہ اعداد و شمار تو موجود نہیں

ہیں، مگر واضح اور بہت حد تک ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے کہ اپنے گھروں پر یا غیر منظور شدہ دینی اور دینی مدرسوں میں پڑھنے والے خصوصاً معاشی اور تعلیم میں پچھڑے طبقوں کے بچے یا وہ بچے جو منظور شدہ مدارس سے کسی اور باقاعدہ اسکول میں داخلہ لے لیں، انھیں اردو تو تھوڑی بہت آتی ہے مگر جدید، تیزی سے بدلتی دنیا کی معلومات ان کے پاس نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

ہمارے بچوں کے ادب پر بنیادی طور پر اب ایسے گروپ کے تعلیمی اور معلوماتی تقاضوں کو پورا کرنے کا فرض عائد ہونا چاہیے۔ مختصراً انھیں بادشاہوں، پیر فقیروں کی بعید از قیاس کرامتوں یہاں تک کہ خالص دینی داستانوں کی بھی اتنی فرصت نہیں، (جو انھیں دینی مدارس میں مل جاتی ہے) انھیں حقیقت میں آج کی دنیا کے سائنسی، تکنیکی، سماجی، معاشی، موسمیاتی وغیرہ وغیرہ جیسے مسائل پر بنیادی معلومات والے دلچسپ اور دیدہ زیب ادب کی ضرورت ہے، جو بالکل ابتدائی۔ تصویری کہانیوں سے شروع ہو کر لگ بھگ دسویں جماعت کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کر سکیں اور انھیں موجودہ دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا سکیں۔

س ج: کیا آپ کی کوئی کتاب نصاب میں بھی شامل ہے؟

غ ح: جتنا وثوق سے مجھے معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ مہاراشٹر میں 'مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی وابھیاس کرم' نے پانچویں جماعت کی نصابی کتاب 'بال بھارتی' میں میری ایک کہانی بعنوان 'ہڈ کی پلیٹ' 2006 میں اور اس سے پہلے ایک اور نصابی کتاب میں میری کتاب 'خط کی کہانی' کا ایک ٹکڑا خطوں کا قبرستان شامل کیا تھا۔

میری چار کتابیں 'پیسے'، 'خط'، 'بینک' اور 'اخبار کی کہانی' (بالترتیب 1973,1974,1978 اور 2000) میں پہلی بار شائع ہوئی تھیں۔ جو مرکزی ادارے NCPUL سے ابھی تک چوتھی اور پانچویں اشاعت میں چھپ رہی ہیں۔

س ج: آپ کو کون کون سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے نوازا گیا ہے؟

غ ح: مجھے بہت سے اعزازات ملے جن میں (بین الاقوامی ادارہ، چلڈرن بک ٹرسٹ، نئی دہلی کے انعامات سے نوازا گیا تھا۔ ان میں سے اہم ایوارڈ اور میرے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے ساتھ اعلیٰ اور عزیز ترین اعزاز میں ٹرسٹ کی ذیلی بین الاقوامی تنظیم، ایسوسی ایشن آف چلڈرین رائٹرس اینڈ السٹریٹرس (AWIC) کا لائف اچیومنٹ ایوارڈ (2012) تھا۔

س ج: ادب اطفال لکھنے والوں کو بچوں کی نفسیات پر گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔ آپ نئے قلم کاروں کو کیا مشورہ دینا چاہیں گے۔

غ ح: میرا خیال، مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھتے وقت ان کی نفسیات سے زیادہ خود اپنی نفسیات کو سمجھنا اور خود پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت سے پہلے اتنا ضرور کہوں گا کہ بچوں کی عمر کے مختلف درجات پر ان کا رویہ اور مختلف کیفیات میں ان کا ردِ عمل، ان کا گہرا مشاہدہ اور اسے ذہن میں رکھنا بچوں کے ادیب کے لیے بنیادی نکتہ ہے۔ (عام طور پر زمرۂ عمر کو 3 تا 6، 4 تا 9، 9 تا 12 اور 12 تا 16 پر محدود کیا جاتا ہے) فی الوقت اس نکتے کی وضاحت نہ کرتے ہوئے صرف اتنا ضرور کہوں گا کہ 3 تا 6 کا نارمل بچہ، 9 تا 12 زمرے سے بہت مختلف رویہ فہم و تجربہ رکھتا ہے۔

دوسرا نکتہ، جو حقیقت میں زیادہ اہم اور عملاً بے حد مشکل ہے۔ وہ ہے، معمر ادیب کی خود گرفت۔ اس سلسلے میں میں صرف دو بزرگوں کی مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کے شنکر پلائی (چلڈرن بک ٹرسٹ اور اس سے ملحق پانچ بین الاقوامی درجے کی تنظیموں کے بانی اور منتظم اعلیٰ، بچوں کے ملیالی ادیب (جنھیں میں انتہائی متاثر کن، نرم قلم، ادیب مانتا ہوں) انھوں نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کی ایک ورکشاپ میں انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے جو جملے کہے تھے انھیں میں بے حد اختصار سے اپنے الفاظ میں دوہرا رہا ہوں۔

عام طور پر بچوں کے لیے لکھنے والے کہتے ہیں کہ معمر لوگوں کو بچوں کے لیے لکھتے وقت بچوں کے لیول تک نیچے اترنا پڑتا ہے، جو یقیناً مشکل ہوتا ہے، مگر میں اس سے بھی بالکل متضاد تصور رکھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھتے وقت ہمیں ان کے معصوم اور بےلوث رویے کے اعلیٰ ترین معیار تک اٹھنا ہوتا ہے، جو ہماری زندگی بھر کے تجربات، مصلحتوں اور ذہنی کج رویوں، پس منظر کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

ہم بچوں کے لیے لکھتے وقت خود اپنے سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم انھی کی عمر کے مطابق لکھیں گے۔ مگر پانچ سطریں لکھنے کے بعد اپنی عمر طبعی پر واپس آجاتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت بنیادی تصور یا منتخب موضوع، پلاٹ یا فارمیٹ، زبان، طرز بیان، مثالیں، کہانی یا مضمون کی طوالت کرداروں کا عمل اور ردِ عمل اور کتنی ہی چیزوں کا خیال رکھنا بچوں کے ادیب کا فرضِ عین ہے۔

س ج: اردو دنیا اور بچوں کی دنیا (رسالے) کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟

غ ح: یہ دونوں رسالے سرکاری اداروں سے شائع ہوتے ہیں کچھ خوبیوں اور پابندیوں کے ساتھ مجموعی طور پر بچوں کے لیے معیاری، مصور، رنگین طباعت وغیرہ کے ساتھ اچھا ادب پیش کرتے ہیں، چونکہ ان کی اشاعت میں بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے، اس لیے بچوں کو دیدہ زیب مواد ہر مہینے آسانی سے مل جاتے ہیں۔

س ج: ہم عصر ادیبوں کے بارے میں کیا رائے اور خیالات ہیں؟

غ ح: ممکن ہے میری یہ رائے کسی کے ناگوار خاطر بھی ہو، بہرطور، معذرت کے ساتھ عام طور پر آج کل بچوں کے لیے لکھنے والے اسے فرض کے جذبے کے تحت نہیں اپناتے اور یہ نتیجہ ہے ادب عالیہ کے ادیبوں اور عوام کے طرزِ فکر کا جو اس صنف کو غیر اہم، ناقابلِ اعتماد اور دوسرے درجے کا ادب سمجھ کر پڑھنے تک کی صورت گوارا نہیں کرتے۔ خود ادیب بھی عام طور پر وقت گزاری (کچھ اور نہیں ہے تو لاؤ بچوں کے لیے کچھ لکھ دیں) کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور آپ بیتی کا کوئی قصہ، پرانی داستانیں، جن کا آج کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے، دوہرا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت لگ کر کام کرنے والے بہت کم ہیں۔

میرے مشاہدے میں مہاراشٹر میں جہاں بچوں کے ادب پر کچھ خصوصی توجہ نظر آتی ہے، محترمہ بانو سرتاج، عطاالرحمٰن طارق، فاروق سید کے علاوہ اور کچھ لوگ ادھر دہلی میں ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی (سائنس پر بچوں کی بنیادی کتابیں)، ڈاکٹر اسلم پرویز رسالہ ماہنامہ سائنس کے مدیر اعزازی وغیرہ کے نام گنے جاسکتے ہیں۔

■

Azadar Husain Sajid Jalalpuri
Mohalla Jafara Bad
Post: Jalalpur
Distt.: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar- 224149 (UP)
Mob.:7571867186
azadarhusainsajid@gmail.com

پرواز احمد

اردو اور بھوجپوری کا رشتہ

زبان کی وسعت اور ترقی میں لوگوں کی ہجرت بھی خاص اہمیت رکھتی ہے جس کی ایک باقاعدہ تاریخ بھی موجود ہے۔ چودھویں صدی میں محمد بن تغلق نے دیوگری کو دولت آباد کا نام دے کر اپنا دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا۔ جس کے سبب بڑی تعداد میں دہلی کی رعایا کو دہلی سے ہجرت کرکے دولت آباد جانا پڑا۔ اس طرح ان کے ساتھ ان کی زبان اور تہذیب و ثقافت بھی دہلی سے دولت آباد منتقل ہوگئی۔

برطانوی حکومت میں بھوجپوری خطّے (جنوبی اتر پردیش اور مغربی بہار) کی عوام کو تلاش معاش کے لیے بندھوا مزدور (گرمٹیا) کی شکل میں مختلف ممالک نیپال، فیجی، ماریشس، ٹرینیڈاڈ، سورینام، گیانا، تھائلینڈ، جنوبی افریقہ، یوگانڈہ وغیرہ جانا پڑا تھا۔ یہ گرمیٹیا لوگ جہاں بھی گئے اپنی زبان اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ گئے اور ایک مدت کے بعد وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

ہندوستان میں اردو زبان بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ عموماً ہندستان کے لوگ اپنی علاقائی زبان کے ساتھ کسی نہ کسی قومی سطح کی زبان کا بھی علم رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے جس بھی حصے یا خطّے میں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں کی کوئی نہ کوئی علاقائی زبان ضرور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس علاقائی زبان پر اردو زبان کا کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہوگا۔ اردو زبان کو اپنی روزانہ زندگی میں استعمال کرنے والے لوگ یا اپنی علاقائی زبان میں اردو کے الفاظ کا استعمال کرنے والے لوگ اردو کو اپنے علاقائی زبان کے صوتی نظام کے حساب سے ہی استعمال کرتے ہیں۔

بعض ماہرین لسانیات بیرون ممالک میں بھوجپوری کے پہنچنے اور بولے جانے کی بڑی وجہ گرمٹیا لوگوں کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ایک بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ بیرون ممالک میں بولی جانے والی بھوجپوری اور ہندوستان کے الگ الگ خطوں میں بولی جانے والی بھوجپوری میں خاصہ فرق ہے۔ یہ فرق صوتی اور لفظی دونوں سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ماریشس اور بنگال کی بھوجپوری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ماریشس میں بولی جانے والی بھوجپوری اور بنگال میں بولی جانے والی بھوجپوری میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کی ایک بڑی وجہ وہاں کے مقامی ماحول و معاشرت اور دیگر علاقائی زبانوں کا اثر بھی ہے۔

اردو زبان کا بھوجپوری پر اثر تلاش کرنے کے لیے دونوں زبانوں کے فن کاروں کے متعلقہ ان خطوں میں دونوں زبانوں کا اثر تلاش کرنا ہوگا جہاں اردو اور بھوجپوری دونوں زبانیں پڑھی یا بولی جاتی ہیں۔ بھوجپوری کی پیدائش کو جس علاقے سے منسوب کیا جاتا ہے وہ علاقہ بہار کا بھوجپور ہے۔ اسی بہار میں اردو کا ایک مرکز دبستان عظیم آباد کے نام سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی ایک الگ پہچان اور اہمیت رکھتا ہے۔ اردو زبان میں فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ زیادہ استعمال ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو جس دور میں پیدا ہوئی اس دور میں ہندوستان میں فارسی زبان کا غلبہ تھا اور فارسی کو سرکاری زبان ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ اس وقت کے ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ اور ادبا و شعرا بھی فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ لیکن اردو ادب میں فن کاروں کے اُس فن اور زبان کو مقبولیت حاصل ہوئی جس میں زبان اردو کی علاقائی زبانوں اور بولیوں کا بھی استعمال کیا گیا تھا۔

اردو، ہندی اور دیگر زبانوں کی طرح بھوجپوری کی قواعد بھی موجود ہے۔ بھوجپوری صرف و نحو اور قواعد کافی حد تک اردو اور ہندی کے قواعد سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح لوک ادب، اردو ادب اور بھوجپوری ادب کے مختلف اصناف کئی معنوں میں ملتے جلتے نظر آتے ہیں بس ان کے نام ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی سطح پر لوک گیت اور اردو ادب کی مختلف اصناف کے بیچ مماثلت کو ڈاکٹر قیصر جہاں اپنی کتاب 'اردو گیت' میں اس طرح دیکھتی ہیں:

''خارجی شاعری کے نمونے ہمیں مثنوی، مرثیہ، نظم جدید، قصیدہ اور رباعی کے ایک حصے میں مل جائیں گے۔ داخلی شاعری کے ذیل میں غزل، گیت، اور

رباعی کا بڑا حصہ شامل ہے۔''

(اردو گیت از ڈاکٹر قیصر جہاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، 1977، ص14)

مختلف موضوعات پر لوک گیت کے مختلف اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں جس میں اردو زبان کے اثر کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

جوڑا-جامہ

''انگ تورے ریشم کا جوڑا
جھالر میں لاگے ہیرا لال رے''

چند مصرعے اور ملاحظہ ہوں۔

''اونچے والان بندا جوڑا سنوارے
اما توری بندے سوروج مناوے،
دولہا کے جانی کوئی نجری لگاوے''

(بھوجپوری لوک گیتوں کے ویودھ آیام از ڈاکٹر جیوتی سنہا، اومیگا پبلی کیشن، 2013، ص195)

''الاہ الاہ لوریاں
دودھ بھری کٹوریاں
کٹوری گئی پھوٹ
چندا ماما گئے روٹھ''

(اتر پردیش کے لوک گیت از اظہر علی فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 1981، ص38)

بھوجپوری زبان میں تعزیہ کو 'داہا میاں' یا 'داہا بابا' بھی کہا جاتا ہے۔ بھوجپوری میں محرم کے مہینے میں کربلا کے المیہ سے متعلق جو اشعار گائے یا پڑھے جاتے ہیں ان کو 'داہا' کے نام سے ہی منسوب کیا جاتا ہے۔ داہا کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

''ہجرت چوڑن مدینہ و مکہ چلن کربلوا کی اور
نانا کا روجوا اور مائی کی کبریا سے دور
ارے پہنچیں اوجاڑی جنگلوا، جہاں جلم کی بدریا گھنگھور
اور کھیلن آپن کھونواں بہائے کے جلم کی تیار میں ٹھور''

(بھوجپوری ادب کا تعارف از ڈاکٹر فضل امام، مطبع اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1947، ص79)

مختلف زبان و ادب میں بارہ ماسہ کی روایت قدیم زمانے سے ہی چلی آ رہی ہے۔ مختلف زبانوں کے علاوہ ہندستان کی مختلف بولیوں میں بھی بارہ ماسے کا رواج دیکھنے کو ملتا ہے۔ بارہ ماسا وہ صنف ادب ہے جس میں عورت کی زبانی اس کے شوہر کی برہ (جدائی) کے اوقات کو سال کے بارہ الگ الگ مہینوں کے اعتبار

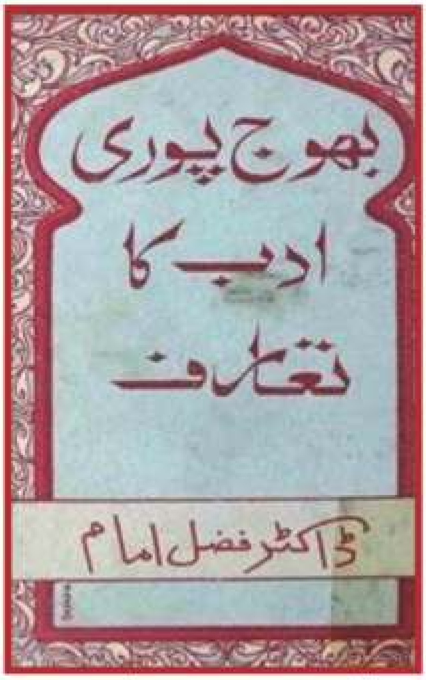

سے پیش کیا جاتا ہے۔ بارہ ماسا میں مختلف موسم، بہار، رت، میلہ، خزاں وغیرہ کی مناسبت سے شوہر کی جدائی میں ہونے والے غم اور احساسات و جذبات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اردو اور بھوجپوری میں گیت کی روایت میں بارہ ماسے کا ذکر قدیم زمانے سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بھوجپوری علاقے کے لوگ ایک زمانے سے گرمٹیہ کی شکل میں روزی روٹی کی تلاش میں بیرون ممالک جاتے رہے ہیں۔ شوہر سے جدائی اور اس جدائی میں سال کے مختلف مہینوں اور موسموں میں شوہر کو یاد کرنے کے عمل کو عورتوں نے اپنے گیتوں میں بھی جگہ دی۔ بھوجپوری برہ یا ہجر کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

''میرے ساجن! تم کو پردیس ہی جانا تھا
تو اے ساجن! میرا گونا کیوں لائے
کس کے ہاتھ چٹھی لکھ کر بھیجوں اور کس سے سندیس کہلاؤں
کوے سے چٹھی بھیجوں اور پنچھی سے سندیس کہلاؤں''

بھوجپوری علاقے کے ادبا نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں وہاں کے علاقائی اور روایتی موضوعات کو خاص طور پر اہمیت دی ہے جس میں حب الوطنی، مشترکہ تہذیب، تیج تیوہار، غریبی، کسانی، پیدائش اور وفات، ذات پات، خواتین کے حقوق، جاگیردارانہ نظام وغیرہ اہم ہیں۔ ان موضوعات کی پیشکش میں متعلقہ سماج کے ضرب الامثال اور کہاوتوں وغیرہ کا بھی بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔

اردو زبان کے جو الفاظ بھوجپوری زبان و ادب میں صوتی تبدیلی کے ساتھ استعمال ہوتے رہے ہیں وہ آج بھی رائج ہیں۔ بعض ادیب انھیں اردو کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں۔ اردو زبان کے جو الفاظ بھوجپوری میں تبدیلی کے ساتھ مستعمل ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھوجپوری میں شامل تو ہوا ہے لیکن اس کو بھوجپوری کے رنگ و آہنگ میں ڈھال کر شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ اردو الفاظ بھی بھوجپوری کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح لوک گیتوں کی زبان بھی علاقائی اور مقامی ہوتی ہے اس وجہ سے الفاظ کے تلفظ پر مقامی اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ بھوجپوری میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی رائج ہیں۔ اس بابت ڈاکٹر فضل امام کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ زیادہ تر اردو اور ہندی ہی سے آئے ہیں۔ یوں تو عربی اور فارسی کے الفاظ تلسی داس کی رامائن رام چرت مانس میں بھی ملتے ہیں۔ سورداس، کبیرداس، ملک محمد جائسی اور بہاری وغیرہ کے یہاں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھوجپوری میں کچھ الفاظ براہ راست فارسی سے آئے ہیں کیونکہ جون پور، ایک عرصہ تک مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ جون پور کے مشرق اور جنوب میں بھوجپوری علاقہ ہے اور جون پور کی شاہ گنج تحصیل بھوجپوری علاقہ میں آتی ہے۔''

(بھوجپوری ادب کا تعارف از ڈاکٹر فضل امام، مطبع اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1947، صفحہ نمبر 22-23)

بھوجپوری میں ترکی اور عربی زبان کے الفاظ کے استعمال کی وجہ بھوجپوری پر زبان فارسی اور اردو کا اثر

اردو زبان کے جو الفاظ بھوجپوری میں تبدیلی کے ساتھ مستعمل ھیں اس کی بڑی وجہ یہ ھے کہ اردو الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھوجپوری میں شامل تو ھوا ھے لیکن اس کو بھوجپوری کے رنگ و آھنگ میں ڈھال کر شامل کیا گیا ھے۔

ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھوجپوری زبان میں اردو، عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ کی بہتات ہے۔

اردو، عربی، فارسی و ترکی زبان کے چند الفاظ ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں جو کچھ تبدیلی کے ساتھ بھوجپوری میں رائج ہیں۔ اُجیر (وزیر)، لاس (لاش)، کھاندانی (خاندانی)، دماگ (دماغ)، نباب (نواب)، ترپھ (طرف)، کابو (قابو)، دسمن (دشمن)، ترکی (ترقی)، دروگہ (داروغہ)، متلب (مطلب)، گلتی (غلطی)، موں کدمہ (مقدمہ)، مسہور (مشہور)، جاگیر، بہادر، ارمان وغیرہ۔

بنارس بھوجپوری کا وہ علاقہ ہے جہاں بولی جاتی ہے۔ اتر پردیش کے اس شہر بنارس میں بھوجپوری زبان کے ساتھ اردو الفاظ کا خاصہ استعمال ہوتا ہے۔ بنارس کے مشہور و معروف شعرا میں نذیر بناری ایک بڑا نام ہے۔ نذیر بناری اپنے کلام میں ان الفاظ کا بخوبی استعمال کرتے ہیں جو اودھ اور اتر پردیش کے جنوبی علاقوں میں عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ نذیر بناری کی نظم 'پیارا ہندوستان' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

کالی بلائیں سر پہ پالے
شام اودھ کی ڈیرا ڈالے
ایسے میں کون اپنے کو سنبھالے
میرا نواس استھان یہی ہے
پیارا ہندوستان یہی ہے

(کلیات نذیر بناری از مرتب ناظر حسین خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2014، ص 22)

نظم 'پہلی جنگ آزادی' (1857 کے شہیدوں کی یاد میں) کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

"موت آئی گلے جو تم سے ملنے
تم نے اسے دیش پیار سمجھا
جب آ کے اجل نے تھپکیاں دیں
ماتا کا اسے دلار سمجھا"

(کلیات نذیر بناری از مرتب ناظر حسین خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2014، ص 30)

نظم 'پیارا ہندوستان' کے بند کے دوسرے مصرعے میں 'ڈیرا' لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا استعمال عام طور سے ٹھہرنے والی جگہ یا مسکن کے معنی میں ہوتا ہے۔ لفظ ڈیرا فارسی سے اردو میں اور پھر اردو سے بھوجپوری زبان اور عام بول چال کی زبان میں استعمال ہوا ہے۔

وہیں دوسرا بند جو 'پہلی جنگ آزادی' نظم سے اخذ کیا گیا ہے اس کے آخری مصرعے میں لفظ 'دلار' کا استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ بھی بھوجپوری، ہندی اور اردو زبانوں میں خوب استعمال ہوتا ہے۔

درج بالا نظموں کے بندوں میں جس اردو زبان کا استعمال ہوا ہے وہ تہذیب و ثقافت اور لوک زبان سے متعلق عوام کے جذبات سے کافی قریب تر ہے۔ اس سے ان علاقے کے لوگوں کا آزادی اور ثقافت کے متعلق رجحان اور ان کی محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب میں بہار اور مشرقی

> بھوجپوری میں ترکی اور عربی زبان کے الفاظ کے استعمال کی وجہ بھوجپوری پر زبان فارسی اور اردو کا اثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھوجپوری زبان میں اردو، عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ کی بہتات ملتی ہے۔

اتر پردیش کے علاقوں کے شعرا جیسے شاد عظیم آبادی، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، اشرف علی فغاں، جمیل مظہری، کلیم عاجز، نذیر بناری وغیرہ کے یہاں علاقائی روایتوں کے اثر کے ساتھ ساتھ عوامی زبان کا خاص اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں میں بولی کا اثر بھی اسی شدت کے ساتھ نظر آتا ہے جس شدت کے ساتھ زبان کا۔

بہار اور مشرقی اتر پردیش کے اردو اور بھوجپوری شعرا کے یہاں ان کی غزلوں اور نظموں میں حب الوطنی، تہذیب و ثقافت، تیج تہوار، مختلف قسم کے پہناوے، مختلف بولیاں، مختلف زبانیں، لوک تہوار، مصوری، روزی روٹی، کسان، خواتین کے حقوق، ماں باپ کی خدمت، اُمید جیسے ادبی و لسانی موضوعات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے یا یوں کہا جائے کہ یہ شعرا عوام کی سادہ زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں اور ان کے احساسات و جذبات اور روزانہ کی زندگی کے عوامل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

کر دیں گے ہم ایک ان کے لیے خون پسینا
ہم کام کیے جائیں گے مارے ہوئے پتّا
آثار بتاتے ہیں پلٹنے کو ہے پانسا
گھورے کے بھی دن کہتے ہیں اک روز پھریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

(نظم 'داستان آدم' گل نغمہ از فراق گورکھپوری، مطبع الف آفسیٹ پرنٹرس، ص 157)

میرا خیال ہے کہ اردو کا بھوجپوری پر اثر دبستان لکھنؤ اور دبستان عظیم آباد کی بڑی دین ہے۔ اردو اور بھوجپوری کے رشتے کے ذیل میں صرف یہ کہہ دینا کہ اردو کا ہی اثر بھوجپوری پر رہا ہے درست نہیں ہوگا۔ کسی بھی ادب میں مؤثر طریقے سے اپنی بات اور احساسات و جذبات کو پیش کرنے کے لیے ادیب متعلقہ علاقے کی بولی اور زبانوں کا استعمال کرتا رہا ہے۔ اردو زبان میں بھی شعرا نے اپنے فن پاروں کو مؤثر بنانے کے لیے مختلف بولیوں اور ان کے الفاظ کو اپنے اپنے فن پاروں میں بہت خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ مثال کے طور پر فراق کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

"پرجا ہی ہے دیش کا راجہ
گھر کی چٹائی راج سنگھاسن
سب کی ٹوپی راج مکٹ ہے
پھوس کا گھر بھی راج محل ہے"

(نظم 'دھرتی کی کروٹ' گل نغمہ از فراق گورکھپوری، مطبع الف آفسیٹ پرنٹرس، ص 162)

نظم کے اس بند میں لفظ پرجا، چٹائی، مکٹ وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو عام بول چال یا لوک ادب میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ایک زبان کسی بولی کو متاثر کرتی ہے اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور صرف و نحو و قواعد کے ذریعے اس کو وسعت و گیرائی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح بولیاں بھی کسی بھی زبان و ادب کے ارتقا، ان کی جامعیت اور ان کے ذخیرۂ الفاظ کی وسعت، ان میں اثر پیدا کرنے اور ان کو عوام سے قریب تر لانے اور مقبول عام بنانے میں مددگار رہتی ہیں۔

■

Parwaz Ahmed
Research Scholar , Department of Urdu
Banaras Hindu University
Varanasi - 221005 (UP)
Mob:7753027349
Email:ahmedvns111@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

تلفظ

مصنف: شکیل حسن شمسی

صفحات: xxiv+184، قیمت: 135 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فیضان الحق، H-99/A، بابر اسٹریٹ، مرادی روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تحریر میں جتنی اہمیت درست املا کی ہے، گفتگو میں اس سے کہیں زیادہ درست تلفظ کی ہے۔ تلفظ کی تبدیلی الفاظ کے معانی میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ بسا اوقات یہ غلطی مبہم یا بے معنی الفاظ کی وجہ بن جاتی ہے، جس سے متکلم کی نااہلی اور زبان پر اس کی کمزور گرفت کا اظہار ہوتا ہے۔ تلفظ ویسے تو تمام زبانوں میں اہمیت کا حامل ہے، لیکن ہندوستان میں بول چال کی دو بڑی زبان اردو اور ہندی اس سلسلے میں کئی اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں زبان کے قواعد تقریباً یکساں اور بول چال میں ایک جیسے ہیں، اس لیے ہندی یا اردو کو گفتگو یا تقریر کا وسیلہ بناتے ہوئے دونوں زبانوں سے بے شمار الفاظ کی لین دین سامنے آتی ہے۔ ایسی صورت میں عربی، فارسی، سنسکرت یا دیگر زبانوں کے الفاظ اگر صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہ کیے جائیں تو معنوی خلفشار اور شرمندگی لازم آتی ہے۔ اس حوالے سے لسانیات کے ماہرین و دانشوروں نے مسلسل کوششیں کی ہیں اور تحریر و تصنیف بھی سامنے آئی ہیں۔ لیکن وقت کے اعتبار سے ہر زمانے میں کچھ نئی کاوشوں کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ نوجوانوں میں اردو کی مقبولیت نے جہاں زبان کی چاشنی کو عام کیا ہے وہیں تلفظ کی ادائگی کے حوالے سے کئی مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اس ضمن میں شروع سے اپنی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عمدہ مثال کونسل سے شائع ہونے والی کتاب 'تلفظ' ہے۔ اس کتاب کے مصنف شکیل حسن شمسی ہیں، جو کہ روزنامہ انقلاب (نارتھ) کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ زبان وادب سے واقفیت کا ثبوت مختلف اخباروں اور ٹی وی چینلوں سے آپ کی وابستگی سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا، لوک سبھائی وی، دوردرشن نیوز اور فلمس ڈویژن آف انڈیا میں آپ نے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی زیر تبصرہ کتاب اولاً 2019 میں شائع ہوئی اور قارئین نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ افادیت کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن بھی 2025 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ کتاب تحریر وتقریر میں مستعمل اہم اردو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔ الفاظ کی فہرست دیوناگری میں تیار کی گئی ہے اور ساتھ ہی اردو میں اس کے صحیح تلفظ اور معانی ومفاہیم درج کیے گئے ہیں، جس سے ہندی بولنے والے اور اردو سیکھنے والے، دونوں طبقوں کے لیے یہ کتاب یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب خلاصہ، احساس، خودکشی، تربت، تپش، تحقیر، زندگی، غلاف، خمسہ، منتخب، ذمے داری اور حذف جیسے متعدد الفاظ کے تئیں استعمال مین رائج غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کا قیمتی پیش لفظ شامل ہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ دینک جاگرن کے مدیر اعلیٰ اور سی ای او سنجے گپت کے اہم خیالات اور صاحب کتاب شکیل حسن شمسی کا تعارفی مضمون بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے اردو زبان کے تعارف کے ساتھ تلفظ کی اہمیت اور کتاب کی تالیف کے اہم نکات کی جانب اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ اردو کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی ان کی شیرینی کے سبب روز مرہ کی گفتگو اور نغموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حروف کی بات کے ذیلی عنوان کے تحت انھوں نے مختلف علاقوں میں پائی جانے والی آوازوں کی بنیاد پر تشکیل پانے والے حروف کی جانب بھی توجہ دلائی ہے۔ اس کے علاوہ غلط بولے جانے والے کچھ الفاظ کی نشاندہی اور نقطے کے ساتھ و نقطے کے بغیر ان کی قرأت سے پیدا ہونے والی دقتوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مبتدی طلبا کے علاوہ زبان وادب سے وابستہ ہر شخص کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

تحقیق و تنقید

غالب : کچھ تحقیق کچھ تنقید

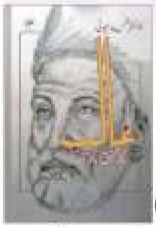

مصنف: شمس بدایونی

صفحات: 408، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: اذہان وارثی، 605 ٹاور والی گلی

جگت پور پولیس چوکی کے پیچھے، گوٹیا، بریلی۔ 243006 (یوپی)

غالب اردو کے واحد شاعر ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اردو تحقیق و تنقید کا مستقل موضوع بن چکے ہیں۔ اردو کے کسی بھی شاعر پر اتنا کام نہیں ہوا ہے جتنا کام غالب پر ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس کام کے چند مثبت پہلو ہیں تو چند منفی بھی۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ غالب کے فکر و فن اور زندگی کے تعلق سے ہر شعبے میں اہم معلومات بآسانی مل جاتی ہے۔ منفی پہلو یہ ہے کہ اچھی کتابوں کے ساتھ ساتھ خراب کتابیں بھی بکثرت موجود ہیں، لہٰذا ایک عام قاری مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب کوئی علمی موضوع تحقیق کی حدود میں داخل ہو جائے اور اس کے مباحث کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہو جائے، ایسے میں اگر اس موضوع پر کوئی غیر معمولی تصنیف منظرِ عام پر آئے جو نہ صرف کسی نئی جہت کو آشکار کرے بلکہ اس موضوع کے حوالے سے فکری و تحقیقی شعور میں وسعت و بصیرت بھی پیدا کرے، تو اس کی تحسین سے گریز ممکن نہیں رہتا۔ ڈاکٹر شمس بدایونی نے اسی نوع کی ایک بلند پایہ، فکر انگیز اور غیر معمولی تصنیف 'غالب: کچھ تحقیق، کچھ تنقید' کے نام سے پیش کی ہے۔

ڈاکٹر شمس بدایونی کا شمار ممتاز اہل علم و ادب میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بلند پایہ محققین و ناقدین ان کی تحقیق و تنقید کی اہمیت اور گہرائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں علمی وسعت، تحقیقی گہرائی اور تنقیدی بصیرت سے بھرپور ہوتی ہیں، جو اہل فکر و دانش کو نئی جہت پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اسی علمی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے، ان کی تصنیف 'غالب: کچھ تحقیق، کچھ تنقید' بھی ادبی و تحقیقی دنیا میں اپنی انفرادیت کے سبب نمایاں مقام حاصل کر چکی ہے اور فکر و تحقیق کے متلاشی اذہان کے لیے ایک اہم علمی سرمایہ ثابت ہو رہی ہے۔

'غالب: کچھ تحقیق، کچھ تنقید' شمس بدایونی کے غالب پر لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات کا وقیع مجموعہ ہے۔ اس میں شمس صاحب کے 22 منتخب تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ممتاز نقاد پروفیسر شافع قدوائی کے تاثرات 'تحقیق اور تنقید کا تخلیقی امتزاج: شمس بدایونی' کے عنوان سے شامل ہیں، جو مصنف کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی شعور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں معروف محقق پروفیسر حنیف نقوی کا شاہد ماہلی مرحوم (ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ) کے نام ایک غیر مطبوعہ خط بھی شامل ہے، جو ڈاکٹر تقی عابدی کی مرتبہ کلیات غالب فارسی کی اغلاط شماری پر مشتمل ہے۔ اسے شمس صاحب نے ضمیمے کے طور پر 'غلطی ہائے کلیاتِ غالب' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ یہ حصہ تحقیق و تصحیح کے باب میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

کتاب میں شامل مقالات و مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

دیوان غالب کی پہلی اشاعت، غالب کا ایک گم شدہ شعر، غالب صدی کے بعد دیوانِ غالب کی قابل ذکر اشاعتیں، غالب تحقیق کے موجودہ امکانات، غالب تحقیقی مقدمات کے تناظر میں، غالب کا سفر کلکتہ (عنوان سے موضوع تک)، غالب: تنقیدی مقدمات کے تناظر میں، تحریک نظم جدید اور سلسلہ غالب، عہد غالب تحریک احیائے دین کے پس منظر میں، دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن، 1857 اور غالب کے معاصر شعرا (فریاد دہلی کے حوالے سے)، خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد کا تحقیقی جائزہ، تفہیم غالب کے مدارج، مرزا غالب اور امیر مینائی کے روابط کا جائزہ، خواجہ حسن نظامی اور غالب، بجنوری، بہ حیثیت ناقد غالب، مجنوں گورکھپوری اور نقد غالب، دیوان غالب کا ایک مستور رامپوری نسخہ، نثار احمد فاروقی کی غالب شناسی، پروفیسر حنیف نقوی بحیثیت غالب شناس، غالب انسٹی ٹیوٹ کا فیضان، غلطی ہائے کلیات غالب۔

ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب نے اپنی مایہ ناز تصنیف 'غالب: کچھ تحقیق، کچھ تنقید' میں تقریباً ہر مضمون اور مقالے کے اختتام پر نہایت عالمانہ اور محققانہ حواشی بھی تحریر کیے ہیں، جو علمی نکات و حقائق کی باریکیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ درحقیقت، یہ حواشی محض ضمنی توضیحات نہیں بلکہ اس کتاب کا ایک لاینفک اور نہایت وقیع حصہ ہیں، جنھیں نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ ان میں موجود دقیق علمی اشارات اور نادر نکات نہ صرف قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ نظر کو غالب پر مرکوز رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی کی زیر نظر تصنیف غالبیات کے میدان میں نہ صرف ایک اہم دستاویز ہے، بلکہ اس میں مضامین علمی بصیرت، تحقیقی عمق، اور ناقدانہ فراست کا شاندار نمونہ ہیں۔ یہ شاہکار تالیف نہ صرف غالب شناسی کے شائقین کے لیے بلکہ اردو ادب کے ہر سنجیدہ محقق و طالب علم کے لیے ایک قیمتی علمی و ادبی تحفہ ہے۔

معاصر اردو افسانے کی تفہیم

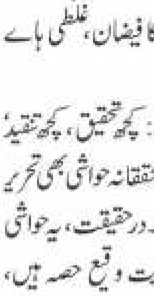

مصنف: ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

صفحات: 128، قیمت: 108 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مطبع: آصفیہ انٹرپرایز، کولکاتا

مبصر: امام الدین امام، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب عظیم اللہ ہاشمی کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل چھ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں شروع کے تین مضامین الگ الگ افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہیں اور اخیر کے تین مضامین مجموعی طور پر مختلف افسانہ نگاروں کی افسانوی جہات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا پیش لفظ بعنوان 'حرفے چند' تقریباً ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حرفے چند کا اسلوب افسانوی ہے۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ موصوف کو افسانوی ادب کے اوصاف اور منظر کشی سے خاص دلچسپی ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'بیگ احساس کا تخلیقی شعور...... 'دخمہ' کی روشنی میں' ہے۔ اس مضمون کے شروع میں مصنف بیگ احساس کے اس مجموعے سے دلچسپی

کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ 'دخمہ' میں کل 11 افسانے شامل ہیں، ان افسانوں کے حوالے سے عظیم اللہ ہاشمی لکھتے ہیں: ''منظر نگاری، جزئیات نگاری اور مکالمہ نگاری سب کے سب کلاسک افسانوں کی شعریات ہیں۔'' (ص 9) بیگ احساس کے اس افسانوی مجموعے کے مختلف افسانوں پر موصوف نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اور اس کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: ''اس تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیگ احساس کا تخلیقی شعور انسانی مسائل اور اس کے زیروزبر کو پیش کرنے پر عبور رکھتا ہے۔'' (ص 13)

اس کتاب کا دوسرا مضمون 'فیروز عابد کے افسانوں میں احتجاج' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے شروع میں موصوف طویل تمہید باندھتے ہیں جس کا براہِ راست تعلق اس مضمون سے نہیں ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے فیروز عابد کے افسانوی مجموعے 'کھلے آسمان کے نیچے' مطبوعہ 1995 کو اپنی گفتگو کا محور بنایا ہے اور اس میں احتجاج کی لے کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

تیسرا مضمون 'شمس ندیم کا: آخری وقفے کا کھیل' ہے۔ شمس ندیم کے ان افسانوں کو مغربی بنگال کے ایک نوجوان قلم کار عمران قریشی نے تلاش و جستجو سے ترتیب دیا تھا۔ بقول مصنف شمس ندیم کے ان فسانوں میں مزدور کی زندگی اور اینگلو انڈین طبقے کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے، بقول مصنف شمس ندیم کا تعلق پہلے ترقی پسند تحریک سے تھا پھر جب جدیدیت کا دور دورہ ہوا تو موصوف جدیدیت کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں ''شمس ندیم کے افسانوں کے کینوس پر ماحول کی عکاسی، حالات کا جبر اور کرداروں کی دلی کیفیت کا اظہار پر اثر طریقے سے بیان ہوئے ہیں۔'' (ص 23)

اس کے بعد تین مضامین مختلف افسانہ نگاروں کی افسانوی نگارشات پر مشتمل ہیں۔ مضمون 'اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگار اور عصری مسائل کا تخلیقی اظہار' میں موصوف نے برصغیر کی خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ یہاں سے ہجرت کر کے مغربی ممالک میں بسنے والی خواتین افسانہ نگاروں کے مہجری افسانے پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس مضمون میں عظیم اللہ ہاشمی مبالغہ سے کام لیتے ہوئے تضاد کے شکار نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں: ''تانیثی موضوع ہر دور میں ادب کا حصہ بنا۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی یہ موضوع قلم کاروں کے لیے مرغوب رہا۔ روئے زمین پر جب حقوق نسواں سلب ہوئے تب تانیثی تحریک نے زور پکڑا۔ اس کی روح میری وال کرافٹ، ورجینا ولف، سیمون دی بوا اور جان اسٹورٹ مل تھیں۔'' (ص 29)

اس کتاب کا پانچواں مضمون 'عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس' ([ثالث نشست (انڈیا) 2021 کی روشنی میں]) ہے۔ غالباً یہ آن لائن افسانوی نشست میں پیش کیے گئے افسانوں کی روداد ہے۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ مختلف ممالک میں بسنے والے اردو کے قلم کار جو افسانے تخلیق کر رہے ہیں ان کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کرنے کی طرف ایک اچھا قدم ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے اپنے مطالعے کی وسعت کا ثبوت دیتے ہوئے مختلف افسانوں کے دیگر سابقہ افسانوں کی یادیں تازہ ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو کہ بین المتونی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کتاب کا آخری مضمون 'عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس' ([عالمی افسانہ فورم (جرمنی) کی پہلی نشست 2022 کی روشنی میں]) ہے۔ اس میں بھی ہندوستان اور اس ملک سے باہر بسنے والے ایسے نئے پرانے قلم کاروں کے افسانوں کا ذکر ہے جو دیارِ غیر میں اُردو افسانے کی برہم زلفیں سنوارنے میں منہمک ہیں۔ مگر مذکورہ تینوں آخر الذکر مضمون میں موصوف نے کہیں بھی کھلے طور پر Diasporic literary eliements پر بات نہیں کی ہے۔ ہاں! کہیں کہیں افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن عظیم اللہ ہاشمی نے کہیں بھی اس میں مہجری فکشن پر کھل کر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اکیسویں صدی میں اُردو فکشن خصوصاً دیارِ غیر میں بسنے والے قلم کاروں کا اچھا تعارف ہے جس میں مختلف نئے اور پرانے مہجری افسانہ نگاروں کے نام اور ان کے افسانوں کا ذکر ہے، ان کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی اس سے مصنف کی تنقیدی بصیرت اور افسانے کی تفہیم اور فکری بالیدگی کا بھی پتہ ملتا ہے۔

پلاموں اور نثری ادب (آغاز و ارتقا)

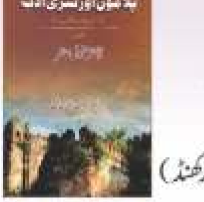

مصنف: ڈاکٹر مقبول منظر، مرتب: ڈاکٹر شرف الدین شیخ

صفحات: 296، قیمت: 550 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 6

مبصر: محمد دانش ایاز، ریسرچ اسکالر، رانچی یونیورسٹی، رانچی (جھارکھنڈ)

ڈاکٹر مقبول منظر کا شمار جھارکھنڈ کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انوار معرفت 1993، چھاؤں مرے حصے کی 2017، روشن دریچے 2021، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'پلاموں اور نثری ادب' (آغاز و ارتقا) کے عنوان سے نثری ادب پر پہلی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر شرف الدین شیخ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بہار سے الگ ہو کر صوبۂ جھارکھنڈ کا قیام 15 نومبر 2000 کو عمل میں آیا اور صوبۂ جھارکھنڈ پانچ کمشنریوں پر مشتمل ہے۔ کولہان، شمالی چھوٹا ناگپور، جنوبی چھوٹا ناگپور، سنتھال اور پلاموں۔ یہ کتاب پلاموں کمشنری کے اردو ادب کے آغاز و ارتقا کا احاطہ کرتی ہے۔ پلاموں کے تحت 3 اضلاع آتے ہیں۔ پلاموں، گڑھوا اور لاتے ہار۔ اس کتاب کو نثری سرمایہ سے مختص کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں پلاموں کی تاریخ کا اجمالی جائزہ ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پلاموں کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ پلاموں، جھارکھنڈ کا ادبی، تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ایک اہم خطہ ہے جہاں کے ادبا اور شعرا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے فنکاروں نے اپنے خونِ جگر سے اردو شعر و ادب کی نہ صرف خدمت کی ہے بلکہ نئی نسل کی پرورش بھی کی ہے۔ پلاموں کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ صوبہ جھارکھنڈ کا پلاموں چھوٹا ناگپور میں واقع ایک حصہ ہے۔ جس کا صدر مقام ڈالٹن گنج ہے۔ جو چھوٹا ناگپور کے کمشنر کرنل ڈالٹن کے نام پر 1864 میں بسایا گیا اور 10/ اکتوبر 1891 میں کر کے دوسرے درجے کا ڈپٹی کمشنر A.V. Jordan کو مقرر کیا۔ لیکن (L.S. Emle) ایل ایس املے 1907 اور (P.S.C.Talent) پی ایس ٹیلنٹ نے 1925 کے پلاموں گزیٹیر میں پہلے ڈپٹی کمشنر کا نام ڈبلو آر برج (W.R,Bridge) نے کرنل اے جورڈن کا نام لکھا ہے۔ لیکن صوبہ بہار کے پرانے

رکارڈ کے مطابق بقول P.C.Roy Choudhry جورڈن (Jordan) ہی سیکنڈ گریڈ کے پلاموں کا ڈپٹی کمشنر ہے جو یکم رجنوری 1892 کو بنا۔ اس کے بعد 1906 میں ڈبلو آر برائٹ (W.R.Brite) فرسٹ گریڈ کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈالٹن گنج کا نام اس سے قبل برجیرا باغ Birgira Bagh تھا جو راجہ دھانی کے نام پر ہے۔

کتاب کا دوسرا باب پلاموں میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا پر محیط ہے۔ اس باب میں قیام جھارکھنڈ سے قبل کے ادیبوں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے تحت علامہ سریر کابری، سید سطوت حسین، سید طاہر حسین رضوی، نادم بلخی، مرزا عبدالستار بیگ، اقبال وارث، فصیح الدین بلخی وغیرہ کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پلاموں کی ادبی تقریبات کا سلسلہ علامہ سریر کابری، مجبور شمسی، نادم بلخی سے شروع ہوتا ہوا عہد حاضر تک آن پہنچتا ہے۔ یہاں ادبی مشاعروں کی پرانی روایت رہی ہے اور مہمان شعرا کی بات کریں تو آنند نرائن ملا، پرویز شاہدی، اختر اورینوی، سید جعفر امام، نشور واحدی، گلزار دہلوی، روش صدیقی، ملک زادہ منظور احمد جیسی شخصیات یہاں آتی رہی ہیں۔

کتاب کے تیسرے باب میں پلاموں میں تحقیق وتنقید پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور اس باب کے تحت مرزا عبدالستار بیگ، نادم بلخی، شعیب راہی، مظفر بلخی، طٰہٰ شیمم، بشیر احمد، اقبال وارث، سید حسن عباس، آفتاب احمد آفاقی، جمیل اختر محبی، سرور احمد خاں، ڈاکٹر محمد غالب نشتر، ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر محمد مرشد وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ نادم بلخی ادبی دنیا میں شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی معروف نثری کتابوں میں تفہیم العروض، شعاع نقد، دلچسپ کہانی وغیرہ اہم ہیں۔ علم عروض کے حوالے سے بھی اُن کی ایک پہچان ہے۔ ڈاکٹر شعیب راہی کا شمار یوں تو شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے لیکن خواجہ حیدر علی آتش: حیات و شاعری، مقدمہ کلام داغ جیسی نثری کتابیں کافی اہم ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مظفر بلخی نے فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے لکھ کر نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اس کتاب میں خاندان بلخیہ کی پوری تاریخ کے ساتھ آبا و اجداد کے کارنامے بھی رقم ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

پلاموں کی ادبی تاریخ میں ڈاکٹر طٰہٰ شیمم کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے 'جھارکھنڈ میں اردو افسانہ' جیسی کتاب لکھ کر افسانوی ادب کا مکمل و مفصل جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کی قرأت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کی افسانوی تاریخ کیا رہی ہے۔ نئی نسل کے فکشن ناقدین میں محمد غالب نشتر کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندو پاک کی افسانوی صورت حال کے حوالے سے کئی اہم مضامین رقم کیے ہیں۔ ان کا تعلق بھی پلاموں کی سرزمین سے ہے۔ تاہنوز تین کتابیں 'اردو افسانہ: نئی جست'، 'مظہرالاسلام کا فکشن' اور 'اردو افسانے کے تخلیقی رنگ' دہلی سے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ نوجوان نثر نگاروں میں ڈاکٹر عبدالباسط اور ڈاکٹر محمد مرشد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر پلاموں کی ادبی تاریخ کافی پرانی ہے اور نئی نسل سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔

اس کتاب کا ایک اہم باب پلاموں کا افسانوی ادب کے حوالے سے بھی ہے اور اس باب میں رفعت بلخی، ظفر اقبال، طٰہٰ شیمم، مقیم شاد اور مبین الدین قریشی کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ ایسے نام ہیں جنھوں نے افسانوی ادب کے حوالے سے اپنی زندگی صرف کی ہے لیکن ادب میں کوئی خاص مقام نہ پیدا کر سکے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ پلاموں کی ادبی تاریخ کے حوالے سے یہ کتاب دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ قوی امید ہے کہ یہ کتاب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جائے گی۔

مضامین

ادبی آب حیات

مصنف: جنگ بہادر گویل، مترجم: محمد زبیر
صفحات: 256، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: اسد رضا، F-97، سیکٹر 7، جسولا وہار نئی دہلی۔ 25

زیر تبصرہ کتاب دراصل مصنف کی ہندی میں لکھی گئی کتاب 'ساہتیہ سنجیونی' کا اردو ترجمہ ہے، چونکہ اس کتاب کا موضوع ادبی ہوتے ہوئے بھی نیا ہے، لہٰذا اس پر دنیا کے مختلف ممالک میں بحث ہو رہی ہے۔ کتاب کا آغاز مصنف جنگ بہادر گویل کے اظہار تشکر سے ہوتا ہے جس کے بعد پنجابی زبان سے ہندی میں اس کتاب کا ترجمہ کرنے والی ڈاکٹر نیلم گویل کے تاثرات ہیں اور بعد ازاں اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کرنے والے محمد زبیر نے کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کے پہلے مضمون 'کتابیں میری زندگی' میں، مصنف نے کتابوں کا موازنہ اپنے والدین اور خاندان کے دیگر افراد سے کرتے ہوئے تحریر کیا ہے 'کچھ کتابوں نے مجھے ماں کی طرح اپنی گود میں بٹھا کر محبت دی، کچھ کتابوں نے باپ کی طرح مجھے اپنے پاس بٹھا کر نصیحت کی، کچھ کتابوں نے بڑی بہن کی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں اور کچھ کتابوں کے ساتھ میں نے کسی گہرے دوست کی طرح اپنے دل کے راز بانٹے۔''

اس کتاب کا دوسرا دلچسپ اور حیرت انگیز مضمون 'ببلیو تھریپی: علاج بالکتاب' ہے جس میں مصنف نے کتب کے طبی فوائد پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں اپنے دلچسپ تجربات بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے اس پرفکر مضمون میں جنگ بہادر رقمطراز ہیں ''ممبئی کی دو ترقی پسند نوجوان خواتین سنیہ رولانی اور اپروپا واتسلیہ نے اپنی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں طلاق، جنسی زیادتی، گھریلو تشدد اور معاشرتی و خاندانی مسائل کا سامنا کرنے والی خواتین کا کتابوں کے ذریعے علاج کرنے کے لیے 'ممبئی ببلیو تھریپی' نامی تنظیم 2019 میں قائم کی۔ اس تنظیم کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر وقت میں ہی 200 سے زیادہ دکھی خواتین کو مثبت زندگی کا نظریہ دینے میں ان کی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ سنیہ رومانی کا کہنا ہے کہ ایک اچھی کتاب سورج کی طرح ہمارے اندرونی اندھیروں کو ختم کر دیتی ہے۔''

زیر بحث کتب کا تیسرا اہم مضمون 'ادبی مطالعہ کے معالجانہ اثرات' جس میں مصنف جنگ بہادر نے ادب کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے طبی فوائد کا بہ تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جو یقیناً قارئین بالخصوص ذہنی الجھنوں، نفسیاتی مسائل اور سماجی و معاشی معاملات میں پھنسے ہوئے قارئین کے لیے مفید ہوں گے۔ مثلاً مصنف کے الفاظ میں ''انسان ہونے کے ناطے سب سے خوبصورت اور قیمتی تحفہ جو

انسانی تہذیب سے ہمیں ملا ہے وہ ہے کتاب۔ اس کے الفاظ کبھی پرانے نہیں ہوتے، اس کی کہانیوں کے کردار کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے اور اس کے گیتوں اور شاعری کے الفاظ ہمارے دل و دماغ میں ہمیشہ گونجتے رہتے ہیں۔ انسان کی فطرت اور دلچسپیوں میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں لیکن انسان کی کہانیاں سنانے اور سننے کی قدیم عادت کبھی نہیں بدلی۔ انسان دراصل کہانیوں میں ہی جیتا ہے اور آخر کار وہ خود بھی ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے۔ کتابیں ہماری سوچ کو وسیع اور اندرونی بصیرت کو بیدار کرکے ہمیں کئی ذہنی بندشوں سے آزاد کرتی ہیں اور ایک مثبت، مضبوط طرز زندگی فراہم کرتی ہیں۔

'ادبی آب حیات' کا چوتھا مضمون 'تحریری تھراپی' ہے جو لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکلنے کے معالجاتی فوائد پر روشنی ڈالتا ہے اور اس سلسلے میں عالمی شہرت یافتہ ماہرین نفسیات نے بھی تحریر کی مدد سے نفسیاتی الجھنوں کو حل کرنے کے معالجاتی طریقے اپنی کتب میں بیان کیے ہیں، مصنف نے اس بارے میں لکھا ہے، کہ ''جب کوئی انسان اپنی تکلیف کو کاغذ پر ظاہر کرنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنے ذہنی کرب سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک سفر پر ہے۔ جدید دور کی تیز رفتار زندگی میں اس کا دکھ سننے کے لیے نہ کسی کے پاس فرصت ہے اور نہ ہی صبر۔ کاغذ کے صفحات ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ وہ دکھ تکلیف کو الفاظ میں ڈھال سکیں۔''

اس کتاب میں اپنے پانچویں مضمون 'لٹریری کلینک' یعنی ادبی دواخانہ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں ''اگر آپ اداسی، بے حسی، سستی، حسد، مایوسی، بے چینی، غصہ، غم، گھریلو پریشانیوں، مستقبل کی فکر، گھبراہٹ، خوف، ہچکچاہٹ، صدمہ، ڈپریشن، راستہ، کسی قریبی عزیز کی اچانک موت پر غمگین، محبت میں دل ٹوٹا ہوا، ازدواجی زندگی میں دراڑ، یا کسی نشے کی عادت سے پریشان ہیں یا زندگی میں رنگ و خوشی کا خاتمہ ہو چکا ہو، رونے کو دل کرتا ہو، گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس ہو، طبیعت میں عجب بے سکونی ہو، طویل علالت یا حادثے کی وجہ سے بستر پر پڑے رہنے کے لیے مجبور ہوں تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے، آپ کو اپنی گھریلو لٹریری کلینک' میں ایسی کوئی کتاب مل جائے گی جو آپ کے لیے تریاق ثابت ہوگی۔

'ادبی آب حیات' کے چھٹے یعنی آخری مضمون کا عنوان' ادب معاشرے کا جراح' بھی ایک پر مغز اور دلچسپ مضمون ہے جس میں مصنف نے ادب کی سرجری یعنی جراحی والی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف تحریر کرتے ہیں ''تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہی ادب کا معاشرے اور ذاتی معاملات پر گہرا اثر رہا ہے کیونکہ ادب اور معاشرے کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سقراط سے لے کر سارتر تک باشعور ادیب اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کے سوئے ضمیر کو بیدار کرتے رہے ہیں اور عوام کو ظلم اور نا انصافی کے خلاف کھڑا ہونے کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ جب بھی معاشرے میں بگاڑ اور برائیوں نے سر اٹھایا، تو مفکرین نے اور ادیبوں نے اپنی آواز اور تحریر کے ذریعے ایسے تباہ کن خیالات کو ایک جراح کی طرح کاٹ کر کچرے کی ٹوکری میں ڈال دیا اور لوگوں کی نظر کو صاف اور ان کی نفسیات کو صحت مند بنایا۔''

یہ کتاب دیدہ زیب ہے اور فکر انگیز مضامین کی حامل ہے لہٰذا توقع ہے کہ اردو میں اس کا پرتپاک خیر مقدم ہوگا۔

ترتیب

ظفر احمد صدیقی: عکس و نقش

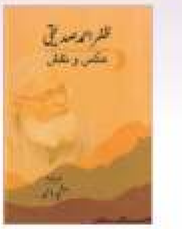

مرتب/ ناشر: مشیر احمد
صفحات: 470، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024
طباعت: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: حقانی القاسمی، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی۔25

اردو تحقیق، تدوین اور تنقید میں مدارس کے جن فضلا اور فارغین نے امتیازی نقوش و نشانات ثبت کیے ہیں ان میں ایک اہم نام پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا ہے۔ ان کا تدریسی رشتہ بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے رہا مگر ان کی تعلیمی سفر کا آغاز مدرسہ ناصر العلوم مئو، چشمۂ رحمت، غازی پور، مدرسہ وصیۃ العلوم، الہ آباد سے ہوا جہاں انھوں نے مبادیات اور متوسطات تک کی تعلیم مظاہر علوم سہارنپور سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ ندوۃ العلما لکھنؤ سے تخصص فی الادب کیا۔ اس کے بعد عصری اداروں کا رخ کیا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور علی گڑھ سے عربی میں ڈگریاں حاصل کیں۔ بنارس سے ہی پروفیسر حکم چند نیر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور یہیں بحیثیت لیکچرر ان کا تقرر رہا۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے ان کی وابستگی ہوئی اور صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

ظفر احمد صدیقی (پ: 10 اگست 1955، قصبہ گھوسی ضلع مئو، و: 29 دسمبر 2020، علی گڑھ) کے علمی اور ادبی آثار کی ایک طویل فہرست ہے جس سے ان کی مطالعاتی وسعت اور موضوعاتی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں قصیدہ: اصل ہیئت اور حدود، نظم طباطبائی، شبلی (مونوگراف)، شبلی کی علمی اور ادبی خدمات، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، نقش معنی اور مرتبہ کتابوں میں شبلی معاصرین کی نظر میں، شرح دیوان اردوئے غالب (نظم طباطبائی)، مقالاتِ نذیر، دیوان ناظم، مثنوی موعظۂ آرائش معشوق (شاہ مبارک آبرو)، انتخاب کلام آبرو، انتخاب کلام مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ظفر احمد صدیقی صحیح معنوں میں بین علومی نقاد تھے۔ عربی اور فارسی زبان و ادب کے نہ صرف شناور تھے بلکہ عربی اور فارسی کی تنقیدی اور تحقیقی روایت پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھیں بہت سے عصری اور دینی علوم مستحضر تھے، اس لیے انھوں نے تدوین، تحقیق اور تنقیح کے باب میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ امتیازات کی حامل ہیں۔ تنقید میں بھی ان کا منہج معاصرین سے بالکل الگ تھا۔ انھوں نے جن موضوعات پر بھی قلم اٹھایا، اس کا مکمل حق ادا کیا، چونکہ اردو کی اساس عربی فارسی سے ان کی گہری وابستگی تھی اسی لیے تدوین و تحقیق میں انھیں اس طرح کی دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس طرح کی پریشانیوں کا سامنا عربی اور فارسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اکثر مدونین اور محققین کو ہوتا رہا ہے۔ کلاسیکی متون کی تدوین میں ان کا عالمانہ انداز مترشح ہے اور یہ اس وجہ سے کہ عربی اور فارسی زبان پر نہ صرف ان کو درک حاصل تھا بلکہ بیان و بدیع پر بھی ان کی گرفت مضبوط تھی۔ اس لیے تدوین ہو، یا تحقیق و تنقید ہر ایک میں انھوں نے اپنا اعتبار و وقار قائم رکھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس تعلق سے بہت اہم اشارے کیے ہیں کہ:

''عربی فارسی پڑھ لینا آسان ہے، لیکن عربی فارسی تہذیب اور تصورات کو

ذہن میں جذب کر لینا اور ان کو اردو تنقید میں استعمال کرنا کہ اَنمل اور بے جوڑ نہ معلوم ہو اور اس عظیم تسلسل کا احساس واضح ہو جو مشرقی ادبیات کا سرمایہ ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں... ظفر احمد صدیقی کی تحریریں عربی فارسی تہذیب سے پوری طرح بہرہ ور ہیں، لیکن انھوں نے ان علوم کو تنگ نظری کی کوٹھری میں نہیں، بلکہ تاریخی تسلسل کی خوش گوار روشنی میں حاصل کیا ہے۔ اسی طرح ان کا طریقۂ کار بھی ادعائی نہیں، بلکہ تجزیاتی ہے۔'' (ص 97-296)

یہی تجزیاتی طریقۂ کار ظفر احمد صدیقی کا نقطۂ امتیاز بھی ہے۔ انھوں نے جن اہم ادبی اور علمی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں نہ صرف نئے نکات، جہات اور زاویوں کی جستجو کی، بلکہ بہت سے مفروضات اور تصورات کی تغلیط، تضعیف اور تردید کے ساتھ ساتھ تسامحات کا استدراک بھی کیا، اس کے لیے جس مطالعاتی وسعت، استدلالی قوت اور دیگر اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے ان تمام سے ظفر احمد صدیقی بہرہ ور تھے۔ اسی وجہ سے مقتدر محققین و ناقدین کی نظر میں ان کی تنقیدات و تنقیحات قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئیں اور ان کے علمی، ادبی استحضار اور وسعت مطالعہ کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی۔ تحقیق کے میدان میں کچھ محققین کے لیے وہ ایک مستند حوالہ اور مرجع و ماخذ بھی بن گئے۔ یہاں تک کہ رشید احمد خان جیسے محقق بھی بہت سے علمی اور ادبی معاملات میں ان سے رجوع فرماتے تھے۔

ظفر احمد صدیقی کا علمی و ادبی قد بہت بلند تھا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس لحاظ سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں ان کی شخصیت و خدمات کے تمام تر اطراف و جوانب کا احاطہ کیا جائے اور یہ فرض کفایہ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر مشیر احمد نے ادا کیا۔ 'ظفر احمد صدیقی: عکس و نقش' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی جس میں عکس کے تحت گیارہ تحریریں ہیں تو نقش کے ذیل میں انیس مضامین ہیں۔ آخر میں ظفر احمد صدیقی کے کچھ اہم مضامین (1) صنف قصیدہ: شعریات، تہذیب، تاریخ (2) نسخۂ حمیدیہ: دریافت، گم شدگی، بازیافت (3) تحقیق منسوبات اور علامہ شبلی نعمانی (4) غیر افسانوی ادب: تصور اور روایت (5) اردو زبان کے امتیازات کا انتخاب بھی شامل کیا جس سے ظفر احمد صدیقی کی علمی اور انتقادی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا دائرہ صرف اردو شعر و ادب کے مباحث تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے موضوعات میں تنوع اور خاصا رنگارنگی ہے۔ انھوں نے بہت سے ان علمی موضوعات پر بھی مضامین تحریر کیے ہیں جو عربی اور فارسی کی روایت سے گہری وابستگی رکھنے والے ہی لکھ سکتے ہیں۔ عربی زبان میں ہندوستانی الفاظ، عربی کی عشقیہ شاعری کے امتیازات، علامہ شبلی اور عربی زبان و ادب، عہد عباسی کی عربی و فارسی شاعری، فارسی قصیدہ نگاری پر عربی اثرات، فرحۃ المدرسین، مصادر سیرت نبی پر ایک نظر، مولانا عبدالحی بہ حیثیت محقق، مولانا احمد تھانیسری اور ان کا نعتیہ قصیدہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت تھانوی کے مواعظ کا ادبی مطالعہ، تحقیق منسوبات اور علامہ شبلی نعمانی، ردِ تشکیل ایک ادبی رجحان، تعقید: ایک ادبی اصطلاح، علامہ شبلی اور حجۃ اللہ البالغہ، فردوسی اور شاہنامے پر محمود شیرانی کی تحقیقات اہم مضامین ہیں۔

'ظفر احمد صدیقی: عکس و نقش' میں جو تحریریں شامل ہیں ان سے ظفر احمد صدیقی کی شخصیت اور ان کے ادبی ابعاد کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے۔ شخصی اور ذاتی نوعیت کے مضامین سے بھی ان کی شخصیت کے بہت سے نقوش روشن ہوتے ہیں۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے ان کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ظفر کے بنارس کے قیام کے دوران مجھے دو تجربے ایسے ہوئے جنھیں میں شاید کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک تو یہ کہ کسی کام کے سلسلہ میں ایک بار میرا بنارس جانا ہوا۔ میرا قیام ظفر صاحب کے ساتھ ہی مدرسہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، بنارس میں ہوا۔ میں کہیں اور ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ ظفر سے میرے تعلق کی نوعیت ایسی ہی تھی۔ ظفر صاحب بھی یونیورسٹی کے کاموں سے فارغ ہو کر زیادہ وقت اسی مدرسہ میں گزارتے تھے۔ وہاں ان کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ بھی تھا۔ رات میں اسی حجرے میں سویا صبح کو فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ظفر کا درس جاری ہے اور بہت سے شاگرد ان کے سبق میں شریک ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت ظفر صاحب حدیث شریف کی مشہور لیکن مشکل کتاب مسلم شریف کا درس دے رہے ہیں اور متن کے مشکل مقامات نہایت روانی اور اعتماد سے کھولتے جا رہے ہیں۔ ظفر کی شخصیت کا یہ پہلو میرے لیے باعث رشک تھا۔''

قاضی جمال حسین نے یہاں جس حجرے کا ذکر کیا ہے، لائبریری جاتے ہوئے اکثر وہاں سے میرا گزرنا ہوتا تھا اور میں نے جب بھی استاذِ محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی کو دیکھا تو انھیں ہمہ تن مطالعے میں مستغرق پایا۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ میں نے ان سے 'تفسیر بیضاوی' جیسی مشکل کتاب کا درس لیا ہے اور ساتھ ہی ان سے متن الکافی بھی پڑھی ہے جو علم عروض کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف حدیث نہیں بلکہ تفسیر اور علم عروض پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

اس کتاب میں نقش کے تحت شرح دیوان اردوئے غالب از سید علی حیدر نظم طباطبائی (شمس الرحمٰن فاروقی)، فارسی زبان و ادب اور ظفر احمد صدیقی (پروفیسر عراق رضا زیدی)، ظفر احمد صدیقی اور رشید حسن (خطوط کی روشنی میں) (ڈاکٹر ٹی آر رینا)، جدید علم کلام: سرسید اور ظفر احمد صدیقی مرحوم (پروفیسر طارق سعید)، پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم: شخصیت و علمی خدمات (پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی)، ظفر احمد صدیقی اور تدوین متن (پروفیسر احمد محفوظ)، دیوان آبرو کی تدوین اور ظفر احمد صدیقی (ڈاکٹر شمس بدایونی)، عربی قصیدہ اور ظفر احمد صدیقی کا بیانیہ: ایک جائزہ (ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی)، انتخاب مومن مرتبہ ظفر احمد صدیقی (ڈاکٹر شاہ عالم)، عالم بے بدل: ظفر احمد صدیقی (ڈاکٹر محمد اختر)، ابتدائی عربی نصاب: ایک جائزہ (ڈاکٹر جمشید احمد ندوی)، پروفیسر ظفر احمد صدیقی: ناقدین و ممدوحین کی نظر میں (ڈاکٹر لئیق احمد)، پروفیسر ظفر احمد صدیقی عربی زبان و ادب کے حوالہ سے (ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن)، مقدمہ دیوان ناظم: ایک تنقیدی جائزہ (ڈاکٹر مامون رشید)، ظفر احمد صدیقی کا مقدمۂ انتخاب کلام آبرو (ڈاکٹر محمد مقیم)، ظفر احمد صدیقی کی حاشیہ نگاری (ڈاکٹر شاہ نواز فیاض)، مقالات نذیر مرتبہ ظفر احمد صدیقی: ایک مطالعہ (ڈاکٹر ابراہیم افسر)، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار: ایک مطالعہ (ڈاکٹر تجمل حسین)، رشید حسن خاں کی تحقیق و تدوین میں ظفر احمد صدیقی کے حوالے (وسیم احمد علیمی) وقیع تحریریں ہیں جن سے ظفر احمد صدیقی کی علمی، ادبی شخصیت کا ایک جامع خاکہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر مشیر احمد کا مقدمہ بھی مبسوط اور جامع ہے جس سے ظفر احمد صدیقی جیسی جامع الکمالات شخصیت کے تمام عکس ونقش سامنے آتے ہیں اور ان کے علمی اور ادبی امتیازات سے آگہی کی ایک اچھی صورت نکلتی ہے، مگر ضرورت ہے کہ سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات وخطبات اور مجلّات میں شائع شدہ ان کے مقالات کی ترتیب واشاعت کا بھی اہتمام کیا جائے۔

انٹرویو

بات کر کے دیکھتے ہیں

مرتبہ: ڈاکٹر ریشا قمر
صفحات: 255، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: پروفیسر غضنفر، بشریٰ، لین A-12، حمزہ کالونی
نیو سر سید نگر ایکسٹینشن، علی گڑھ، یوپی

'بات کر کے دیکھتے ہیں' اردو کے نامور ادیبوں کے انٹرویوز پر مشتمل ڈاکٹر ریشا قمر کا ایک ایسا تصنیفی آئینہ ہے جس میں قلم کاروں کی حیات ونفسیات کے ساتھ ساتھ معاصر اردو زبان وادب کے رجحانات ومیلانات اور تخلیقی صورت حال کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر ریشا قمر ترتیب وتدوین کے میدان میں مہارت تو رکھتی ہی ہیں جس کا ثبوت ان کی یہ کتابیں:

رفعت قلم، ارژنگ قلم (جلد اول ودوم)، کرناٹک میں اردو: ماضی اور حال، آبپاژہ، اردو کی تیرہ مقبول کہانیاں اور غضنفر شناسی ہیں۔ اب انھوں نے میدانِ ادب وفن میں ایک اور جانب بھی قدم بڑھا دیا ہے۔ اور ان کی رفتار بتا رہی ہے کہ وہ اس فیلڈ میں بھی اپنے نشانات ثبت کریں گی۔

عنوان بتاتا ہے کہ یہ واقعی ایک نئے انداز اور ایک نئے تیور کی تالیف ہے۔ عنوان یہ بھی اشارہ دیتا ہے کہ کتاب کی مرتبہ ڈاکٹر ریشا کا مقصد ومنشا ادیبوں اور فن کاروں سے محض بات کرنا نہیں بلکہ ان کے فن اور اس فن کے محرکات وعوامل کا پتا لگانا بھی ہے۔ کسی فکشن نگار کی فنی باریکیوں کو سمجھنا بھی ہے۔ اس کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانا بھی ہے اور اس کی ان ذہنی کیفیات اور نفسیاتی نکات تک رسائی بھی حاصل کرنی ہے۔ جن کے زیرِ اثر تخلیقات معرضِ وجود میں آتی ہیں اور کوئی مخصوص ومنفرد رنگ وآہنگ اختیار کرتی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے کتاب کے عنوان میں لفظ دیکھنا پر زیادہ زور دیا ہے۔ یہ لفظ دیکھنا بڑا ہی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ اس لفظ کی معنویت میں بہت سارے شیڈس ہیں۔ اس میں محبوبیت، نشتریت، رمزیت، ایمائیت سبھی کچھ ہے۔

ریشا قمر نے جن ادیبوں تک رسائی حاصل کی ہے ان کے نام ہیں:

سلام بن رزاق، نورالحسنین، عبدالصمد، غضنفر، صغیر افراہیم، طارق چھتاری، اقبال حسن آزاد، سید محمد اشرف، محمد حمید شاہد، حافظ کرناٹکی، خواجہ محمد اکرام الدین اور الطاف یوسف زئی۔

یہ سبھی نام کسی نا کسی اعتبار سے معتبر اور مستند ہیں۔ یہ اپنے اپنے میدانوں کے کامیاب شہسوار ہیں۔ ان ناموں کا انتخاب اس بات کا غماز ہے کہ ریشا قمر کا ادبی ذوق کسی ایک صنف یا ایک رنگِ فن تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ تخلیق، تنقید، تحقیق سبھی کو پسند کرتی ہیں ان کا تنقیدی ذہن ہر ایک تک پہنچتا ہے۔ سبھی کو پرکھتا ہے۔ ان کا تخلیقی ذوق انھیں شاعری تک بھی لے جاتا ہے اور افسانہ وناول تک بھی پہنچاتا ہے۔

ان کا قلم ہر ایک صنف ادب کی دھار اور اس کے آہنگ واسرار کو سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بھی چاہتا ہے۔ ان کا خامہ اس بات کا بھی پتا لگانا چاہتا ہے کہ یہ ادیب وفن کار ویسے ہی ہیں جیسا کہ اپنی نگارشات وتخلیقات میں دکھائی دیتے ہیں یا ان کے خط وخال ان سے مختلف ہیں۔ ان کے باطنی رنگ روپ کیا ظاہری شکل وصورت سے الگ ہیں۔ وہ اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتی ہیں کہ سید محمد اشرف، طارق چھتاری، صغیر افراہیم اور غضنفر ایک دوسرے سے مختلف کیوں کر ہیں جب کہ یہ چاروں ایک ہی شہر ایک ہی وقت اور ایک ہی ادارے میں پروان چڑھنے والے فنکار ہیں۔ ان کا رنگ ایک دوسرے مختلف کیوں ہے۔ ان کی تخلیقات ایک جیسی کیوں نہیں ہیں۔ ان کے انفرادی رنگ کا سبب کیا ہے؟

شاہد حمید کے فکشن میں وہ کون سے رنگ ہیں جو انھیں ہندستانی فکشن نگاروں سے ممیز کرتے ہیں۔ فکشن کے ساتھ ساتھ انھیں فکشن تنقید میں دلچسپی کیوں ہے۔

حافظ کرناٹکی بچوں کا ادیب کہلوانا پسند کرتے ہیں یا یہ پسند انھیں نا پسند ہے، ادب اطفال میں ان کا کیا کنٹری بیوشن ہے۔ پٹنہ اور پاٹلی پترا کے پوربی ماحول میں پروان چڑھنے والے عبدالصمد کی زبان غضنفر کے زبان وبیان سے کیوں کر مختلف ہے۔ سیاسی موضوع دونوں کے ناولوں میں موجود ہے مگر ایک کے یہاں دھمک کے ساتھ دکھائی دیتا ہے جبکہ دوسرے کے یہاں ڈھکے چھپے انداز میں ملتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا راز بھی جاننا چاہتی ہیں کہ صغیر افراہیم نے فکشن کی تخلیق میں دلچسپی کم اور فکشن تنقید نگاری میں زیادہ کیوں لی؟ نورالحسنین، سلام بن رزاق سے کیسے مختلف ہیں وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہیں۔

ریشا قمر بات کر کے دیکھنا اس لیے چاہتی ہیں کہ بات کرتے وقت وہ نکات بھی باطن سے باہر نکل آئیں جو نگارشات میں نہیں آپاتیں۔ وہ گرہیں بھی کھل جاتی ہیں جنھیں فن کار باندھ کر رکھنا چاہتا ہے۔ ریشا اپنے سوالوں کی نوک سے ان پردوں کو بھی چاک کر دینا چاہتی ہیں جو تخلیق کے اصل حسن وقبح کو سامنے نہیں آنے دیتے۔

انٹرویوز کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ڈاکٹر ریشا نے 'باتیں ہماری یاد رہیں گی' کے عنوان سے ایک مقدمہ بھی سامنے رکھا ہے۔ جس میں یہ اقتباس بھی درج ہے:

''کامیاب انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ سوال ایسے پوچھے جائیں کہ انٹرویو دینے والا ان باتوں کو بھی بتا سکے جنھیں وہ چھپاتا رہا ہے اور اس انداز سے پوچھے جائیں کہ تلخ نوعیت کے سوالات بھی طبع نازک پر گراں نہ گزریں۔''

مقدمہ میں درج اس اصول پر ریشا قمر نے عمل بھی کیا ہے۔ کوئی بھی ایسا سوال نہیں پوچھا ہے جو فن کار کے طبع نازک پر گراں گزرے۔ وہ اکثر جگہوں پر باطن کو باہر لانے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں ان کی یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔

ایک سوال ڈاکٹر ریشا قمر نے تقریباً سبھی ادیبوں سے پوچھا کہ اردو زبان کے کیا کیا مسائل ہیں اور ان کی نظر میں ان مسائل کا کیا حل ہے۔ ہر ایک قلم کار سے یہ سوال پوچھنے کے پیچھے مقصد شاید یہ رہا ہو کہ وہ جاننا چاہتی ہوں کہ ادیب جتنا اپنے ادب کے تئیں سنجیدہ ہیں کیا وہ اتنا ہی اپنی زبان کے لیے بھی ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اردو کے تحفظ اور ترویج کے لیے ان کے پاس کیا لائحہ عمل ہے؟

تمام انٹرویوز پڑھنے کے بعد جو کافی کارآمد باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:

- فنکاروں کے فن کے متعلق ان کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟
- نقادوں کے کسی مخصوص تنقیدی مسلک سے وابستگی کے اسباب کیا ہیں۔
- مختلف خطوں میں اردو زبان وادب کی کیا صورت حال ہے۔
- کسی کی تحریروں میں کسی خاص طرح کے ڈکشن کے استعمال کی وجوہات کا سبب کیا ہے؟
- معاصر ادب کے متعلق ادیبوں کی کیا رائے ہے۔
- فن کاروں کی ان تخلیقات کا علم ہوا جو ابھی پردۂ خفا میں ہیں۔

سوالوں کی نوعیت، ان کی کاٹ اور ان کے لب و لہجے سے ڈاکٹر ریشما قمر کے افکار وخیالات کا پتا چلا، ساتھ ہی، ان کے اپروچ اور ان کی ترجیحات کا علم بھی ہوا۔ نیز اس بات کا احساس بھی ہوا کہ مختلف ادیبوں تک رسائی حاصل کرنے میں مرتبہ نے کتنی محنت اور جاں فشانی اور تگ ودو کی ہے۔

نہایت جاں گسل، انہماک اور محنت ومشقت سے لیے گئے انٹرویوز پر مشتمل یہ کتاب ایک عمدہ اور قابل قدر دستاویز ہے جس کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

شاعری

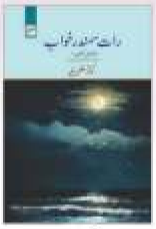

رات سمندر خواب

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 183، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: احمد کفیل، شعبۂ ہندوستانی زبان، سنٹرل یونیورسٹی آف ساؤتھ بہار، گیا

’رات سمندر خواب‘ کوثر مظہری کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل حمد ونعت کا مجموعہ ’عرش وطیبہ‘ 1998 میں اور نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ’ماضی کا آئندہ‘ 2008 میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ’رات، سمندر خواب‘ بھی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس تازہ مجموعے کو پڑھنے کے بعد پہلا احساس یہ ہوا کہ ایک ایسے فطری شاعر سے شناسائی ہو رہی ہے جنھیں تنقید وتحقیق نے اچک لیا تھا۔ کوثر مظہری نے 1980 کے بعد شاعری شروع کی اور ایک منجھے ہوئے فنکار کے تیور میں سامنے آئے۔ قارئین نے انھیں پڑھا بھی لیکن اپنی تحریروں میں اس طرح ذکر نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ خود شاعر نے بھی اپنا یہ ہنر اوراق میں تہہ کر لیا تھا۔ اب جو یہ شعری مجموعہ سامنے آیا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ نگار شوق نے انھیں راستہ دکھایا ہے۔

’رات سمندر خواب‘ میں ان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی، اپنے شدید جذبے اور احساس کے ساتھ پروان چڑھی ہے۔ ان کی زبان، آواز اور آہنگ میں ایک شبنمی لطافت ہے۔ بقول شاعر

میں نے شبنم سے چمکنے کی ادا سیکھی ہے — مجھ کو آتا نہیں سورج کی کہانی لکھنا

کوثر مظہری کے مجموعہ کلام ’رات سمندر خواب‘ میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ سرورق پر مذکورہ مجموعے کے نام سے وابستہ عکس ہے۔ بیک کور پر معروف ناقد ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کوثر مظہری کی شاعری کے فطری رنگ، ہند اسلامی تہذیب وتمدن کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ پروفیسر کوثر مظہری غزل اور نظم دونوں میں نوکلاسیکی شعریات سے دلی ربط وضبط رکھتے ہیں۔ دائیں جانب فلیپ پر ارشد عبدالحمید نے موصوف کی شاعری سے متعلق اظہار خیال کیا ہے اور بائیں فلیپ پر ڈاکٹر جمال اویسی نے لکھا ہے۔ ارشد عبدالحمید نے کوثر مظہری کی شعری زبان کی شیرینی اور شائستگی کے ساتھ شعری جمال سے متعلق باتیں کی ہیں اور ڈاکٹر جمال اویسی نے لکھا ہے کہ:

’’اسی 80 کے بعد والوں میں سے ہم چار پانچ ہی ایسے تھے جو اپنی زمینی سچائیوں سے جڑے ہوئے تھے اور اپنی تخلیقی محرکات کے اسیر تھے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا ماضی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ کسی نہ کسی شکل اور صورت میں وہ شاعر کے وجود کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔‘‘

کتاب کا انتساب عہد حاضر کے دانشور، نقاد، شاعر، ماہر ادبی اصطلاحات، ڈراما نگار اور خاکہ نگار پروفیسر عتیق اللہ کے نام کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں معروف ناقد پروفیسر شافع قدوائی نے ’انفرادی سچ کا حسی بیانیہ‘ لکھا ہے، اور خود شاعر نے شعری اظہار کی نثری توجیہ کی ہے۔ اس کے بعد حمد، نعت کی ابتدا سے کئی ادوار کی نظموں اور غزلوں کو جمع کیا ہے۔ ان میں تازہ غزلوں کی تعداد 56 ہے اور 20 نظمیں ہیں۔ ماضی کا آئندہ سے چھ غزلیں اور چار نظمیں، پرانی بیاض سے دو غزلیں اور تین نظمیں جو 1991 سے 1994 کے درمیان کہی گئیں۔ پرانی بیاض کے حصہ دوم میں 1987 سے 1990 تک سولہ غزلیں اور دو نظمیں اور اس کے حصہ سوم میں 1982 سے 1986 تک کی پانچ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

’انفرادی سچ کا حسی بیانیہ‘ میں پروفیسر شافع قدوائی نے کوثر مظہری کے شعری محاورے اور انفرادی تجربے سے بحث کی ہے۔ انھوں نے کوثر مظہری کے شعری تجربے کو منطق اور فلسفے کے تناظر میں دیکھا ہے۔ مثلاً آگ اور پانی کا تعلق تضاد ہے لیکن کوثر مظہری نے دونوں میں یکساں پاکیزگی کا پہلو تلاش کیا ہے۔

روشنی ہی روشنی ہے چار سو پانی کے بیچ — کس کے آنسو سے ہوا روشن دیا پانی میں ہے

اسی طرح موصوف نے کوثر مظہری کے دیگر شعری تلازمے خواب، مٹی، خاک، تنہائی، خاموشی، فراموشی اور یادآوری وغیرہ کے فلسفے کی توضیح پیش کی ہے۔ خاک کی توضیح پیش کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ ’’مشت خاک سے اٹھنے والے انسانی وجود کا بنیادی حوالہ تحرک ہے۔ تغیر آسا اور پارہ صفت مٹی آدمی کو ہمیشہ رو بہ عمل رکھتی ہے اور یہی اس کا بنیادی شناس نامہ بھی ہے۔ مٹی بظاہر ساکت اور جامد ہوتی ہے مگر فی الاصل یہ ہمیشہ گردش میں رہتی ہے اور انسان کو معرکۂ زیست سے نبرد آزما ہونے کی طرف راغب کرتی ہے۔

چاق چوبند بہت رہنا ہے کوثر اب کے — ورنہ اٹھنے کی نہیں ہم سے تو اب تہمت خاک

کوثر مظہری کے انفرادی واجتماعی تجربات جس طرح ان کی شاعری (نظموں اور غزلوں) میں در آئے ہیں وہ قاری کو اپنا گرویدہ کرتے ہیں۔ ابتدائی شاعری کا بانکپن اور حالیہ شاعری کا معنوی افق قاری کے سامنے بہت سے سوالات پیدا کرتے ہیں۔ مشت نمونہ از خروارے ملاحظہ کیجیے۔

وہ خواب تھا یا خواب کی تصویر تھی کل شب — اب خواب کو بلواؤں کہ منظر کو پکاروں
اک صدا بھولی ہوئی کانوں سے ٹکرائی تھی کل — پہلے تو آنسو گرے، آواز پھر بھاری ہوئی
حال میرا ٹوٹ کر بکھرا ہوا — جانے کس ماضی کا آئندہ ہوں میں

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے خبر نامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

فن خطاطی کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل میں کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن کے ماہرین کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن کے ماہرین کی میٹنگ ہوئی جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے ماہرین شامل ہوئے۔ یہ میٹنگ خطاطی اور گرافک ڈیزائن کے کورس کے اپڈیشن، کورس کے مواد میں ترمیم اور کورس کو مزید پرکشش اور مفید بنانے پر غور کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر

ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ کیلی گرافی کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے اور نئی تعلیمی پالیسی (NEP 2020) میں بھی اس کو خاص جگہ دی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کیلی گرافی میں جدت اور نیا پن لانا بے حد ضروری ہے اس کے بغیر ہم اپنے آرٹ کو زیادہ دن تک محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن کورس کو وقت کے ساتھ اپڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں اور اس کورس کی تکمیل کے بعد انھیں روزگار کے مواقع میسر ہوں۔ میٹنگ میں شامل ماہرین نے کئی اہم اور مفید مشورے دیے جن کی روشنی میں خطاطی کے کورس کو اور بھی مفید اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ اس میٹنگ میں پروفیسر ظہور احمد زرگر، جناب خورشید عالم، جناب انیس الحق صدیقی، جناب فیض احمد، جناب مشتاق احمد، جناب محمد عارف، جناب وکیل بستوی، جناب محمد زبیر، جناب امیر الدین علوی اور محترمہ عرش کوہ نور صاحبہ کے علاوہ ریسرچ آفیسر انتخاب احمد اور محمد قاسم وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 فروری 2025

قومی اردو کونسل میں ماہنامہ خواتین دنیا کے خصوصی شمارہ 'خواتین اور سائنس' کا اجرا

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر جسولہ میں ماہنامہ خواتین دنیا کے خصوصی شمارے 'خواتین اور سائنس' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ وکست بھارت کے مشن کی مضبوطی کے لیے خواتین کی شمولیت ناگزیر ہے۔ اگر ہمارے ملک میں عورت ترقی نہیں کرے گی تو ہم وکست بھارت کے ہدف کو حاصل نہیں کرسکیں گے۔ مہمان خصوصی، مشہور بایولوجسٹ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق پرووائس چانسلر پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کہا کہ خواتین دنیا کے خصوصی شمارے ''خواتین اور سائنس'' کی اشاعت ایک خوش آئند قدم ہے۔ ہندوستان میں خواتین سائنس

کے میدان میں گراں قدر اور نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں اور جلد ہی ہندوستان دنیا کی ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس نوع کا خصوصی شمارہ وکست بھارت کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے سلسلے میں بھی مفید اور معاون ثابت ہوگا۔ قومی کونسل مسلسل اس جانب کوششیں کر رہی ہے۔ اجرا کی اس تقریب میں قومی کونسل کا تمام عملہ موجود تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 فروری 2025

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

انسانی تہذیب کی افزائش میں ترجمے کا کردار

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں 'انسانی تہذیب کی افزائش میں ترجمے کا کردار' کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں عمان کے سفیر عیسیٰ بن صالح الشیبانی نے کہا کہ ترجمہ محض ایک لسانی عمل نہیں بلکہ ایک ثقافتی پل ہے جو مختلف قوموں اور تہذیبوں کو جوڑتا ہے۔ عرب لیگ کے مشن کے نمائندے ڈاکٹر مازن المسعودی نے تاریخی حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ترجمہ علم کے تبادلے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ پروفیسر مجیب الرحمٰن، سربراہ سنٹر فار عرب اینڈ افریقن اسٹڈیز نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے جے این یو میں ترجمے کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ترجمے کو ثقافتوں کے تبادلے اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ کانفرنس کے ڈائریکٹر پروفیسر اشفاق احمد نے وضاحت کی کہ ترجمہ نے علمی اور سائنسی ترقیات خاص طور پر عربی علوم کو یورپ میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جے این یو کے ریکٹر پروفیسر دیپن درناتھ داس نے یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی کوششوں کو سراہا اور ترجمے کو بین الثقافتی روابط کا لازمی عنصر قرار دیا۔ شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر قطب الدین ندوی نے کلمات تشکر پیش کیا۔ کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس ٹی سیتاناتھ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے تاریخ میں پائے جانے والے ترجمے کے مختلف ماڈلوں کو پاور پوائنٹ کے ذریعے بیان پیش کیا۔ دو روزہ کانفرنس میں 62 پیپر پڑھے گئے۔ عربی کے سینئر اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر سینٹر سے شائع ہونے والا علمی اور تحقیقی مجلّہ 'دراسات عربیۂ' کے گیارہویں شمارہ اور طلبہ کی میگزین 'الینبوع' کے دوسرے شمارے کی بھی رسم اجرا عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 فروری 2025

اردو-ازبک کے ادبی ولسانی رشتے

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز جے این یو میں اردو-ازبک کے ادبی ولسانی رشتوں پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کے زیر صدارت یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ، ازبکستان سے پروفیسر محیا عبدالرحمانوا، ڈاکٹر نیلوفر خودجائیوا اور ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف نے مقررین کی حیثیت سے شرکت کی۔ ازبکستان کی محقق ومترجم ڈاکٹر نیلوفر خودجائیوا نے بابرنامہ، قلی قطب شاہ سے لے کر غالب و اقبال تک متعدد کلاسیکی شعرا کے کلام کے ازبک تراجم پر بات کرتے ہوئے ازبک مترجمین اور لغت نگاروں کی خدمات سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف نے اردو-ازبک تراجم پر بات کرتے ہوئے پریم چند کے ناول 'غبن' اور 'گئودان' کے ازبک تراجم پر گفتگو کی۔ پروفیسر محیا عبدالرحمانوا نے اردو- ازبک الفاظ کے تعلق سے بات کی۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو-ازبک کے لسانی رشتوں کے تعلق سے چند ایسے الفاظ سے طلبہ کو روشناس کرایا جو ازبک اور اردو میں یکساں معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ سمینار میں ہندی کے استاذ پروفیسر دیویندر کمار چوبے، پروفیسر بندنا جھا چیئرپرسن سی آئی ایل جے این یو نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2025

ہندی ادب میں صوفی بھکتی کی روایت

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام 'ہندی ادب میں صوفی اور بھکتی روایت' پر یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا

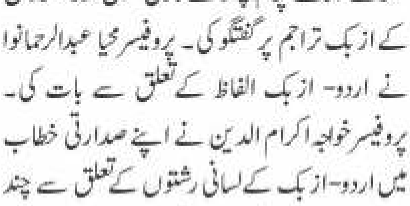

گیا۔ اس موقعے پر لکشمی شنکر واجپئی نے کہا کہ صوفی سنتوں نے عشق اور ایکتا کی بات کی۔ ملک محمد جائسی سے لے کر آج کے ہندی شاعروں کا بھی یہی پیغام ہے۔ شمیم طارق نے کہا کہ جائسی، شاہ قادر قلندر، شاہ تراب علی قلندر سے لے کر حسرت موہانی نے غزل کی آبرو کو قائم رکھا۔ انھوں نے کرشن بھکتی اور خدا پرستی کا درس دیا ہے۔ پروفیسر جانکی پرساد شرما نے کہا کہ بھکتی کال نے یہ پیغام دیا کہ ہم اپنی بات کو مرنے نہیں دیں گے۔ ہمیں پریم کے راستے کو اپنانا چاہیے۔ سمینار میں صوفی الکھ داس یعنی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کی ہندی شاعری پر ایک مقالہ ڈاکٹر رخشندہ روحی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ الکھ داس فارسی اور اودھی کے اچھے شاعر تھے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے میرابائی پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ بھکتی شاعری کی تین واضح شاخیں ہیں۔ نرگن شاخ میں کبیر داس کا نام آتا ہے۔ تلسی داس، رام بھگت اور سورداس، میرابائی وغیرہ کرشن بھکتی کے شاعر تھے۔ کبیر عشق حقیقی کی آخری منزل پر پہنچ گئے تھے۔ ممتاز عالم رضوی نے نظامت کی۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال نے رام اور گرونانک پر نظم لکھی۔ سیما کوشک نے دوہے، ریتو استھانا، ڈاکٹر نیلم باورامن نے شری کرشن اور ڈاکٹر امرتا امرت نے شری رام سے متعلق اپنی نظمیں پیش کیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تجویز کو وزارت ثقافت حکومت ہند نے پسند کیا اور غالب اکیڈمی کے پروگراموں کی سرپرستی کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2025

تنویر احمد علوی کی ادبی خدمات

نئی دھلی: ممتاز نقاد، معروف مترجم اور معتبر شاعر و ادیب ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی 12 ویں برسی کے موقعے پر غالب اکیڈمی میں ادبی تنظیم قلمکار اور غالب اکیڈمی کے اشتراک سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس

میں مختلف ادبی اور علمی شخصیات نے ڈاکٹر علوی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ممتاز عالم دین علامہ سید عقیل الغروی نے مذاکرے میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور کلیدی خطبہ پیش کیا۔ علامہ عقیل الغروی نے ڈاکٹر تنویر احمد کو ایک مکمل تہذیبی شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی خدمات اور ان کی شخصیت کی اتنی جہتیں ہیں کہ ان پر بات شروع تو کی جاسکتی ہے لیکن ختم نہیں کی جاسکتی۔ نامور فارسی اسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر علوی کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مولانا مظہر الحق یونیورسٹی، پٹنہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی حکومت ہند کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر ارتضی کریم، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر احمد محفوظ، ایم جی پی جی کالج سنبھل کے شعبہ اردو کے پروفیسر عابد حسین حیدری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم پرویز، غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد اور پروگرام کے کنوینر لئیق رضوی نے ڈاکٹر علوی کی ذات و کمالات کی مختلف جہتوں کو اجاگر کیا۔ ان کے علاوہ مختلف شخصیات ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے فرزند ڈاکٹر نوید اقبال، جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ ہندی کے استاذ ڈاکٹر حیدر علی، صحافی ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، صحافی ڈاکٹر مظہر حسنین اور تدریس سے وابستہ مصنفہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت شاعر معین شاداب نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ثمر جہاں کی مرتبہ تنویر احمد علوی پر دو کتابوں 'شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسائی گیتوں کی روایت' اور 'نشانات نور' سنت درشن سنگھ کی شاعری کے تجزیاتی مطالعہ کا مہمانان کرام کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ مذاکرے میں شعرا، ادبا، صحافیوں اور ریسرچ اسکالرز کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 فروری 2025

اردو اور طب یونانی کی صورت حال

نئی دهلی: طب یونانی کا فروغ اردو کی ترویج و ترقی کا موثر ذریعہ ہے اور اس کی اشاعت کا مطلب ہی اردو

کو فروغ دینا ہے۔ اردو اکیڈمی کے اشتراک سے عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوی ایشن کی جانب سے "دہلی میں اردو اور طب یونانی کی صورت حال" عنوان پر منعقدہ سمینار سے خطاب میں پروفیسر عبدالحق نے یہ بات کہی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سابق ایم ایل اے چودھری متین احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہمارا سرمایہ ہے، ہمیں اپنے حصے کا حق ادا کرنا چاہیے اور اپنے بچوں کو خاص طور سے اردو کی تعلیم دینا چاہیے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ طب یونانی کے حوالے سے تین بڑے نام ہیں اُن میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں، جامعہ طبیہ دہلی کے بانی حکیم محمد الیاس خاں شروانی اور حکیم عبدالحمید صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر حبیب سیفی نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو قوموں کو متحد رکھنے کا سبق دیتی ہے۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان خان نے کہا کہ اردو اور طب یونانی کا رشتہ زمانۂ قدیم سے ہے، اس کی ترویج و ترقی میں مدارس و مکاتب اور طب یونانی کا انتہائی اہم کردار ہے۔ ڈاکٹر قمرالدین ذاکر (صدر، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، ہریانہ اسٹیٹ) نے کہا کہ طب یونانی کا علمی سرمایہ اردو میں ہے، اس ذخیرے کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔ محمد ارشد چودھری نے کہا کہ طب یونانی اور اردو روزگار کا بہترین ذریعہ ہیں اور ہمیں اس کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر محمد ارشد غیاث نے کہا کہ اردو اور طب یونانی کی تحریک نہایت ضروری ہے، دونوں ہمارے کلچر کا حصہ ہیں۔ ایڈووکیٹ شان جبین قاضی نے کہا کہ اردو سماج میں میل محبت کو فروغ دینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں اشرف میواتی، ڈاکٹر الطاف احمد، یوسف ملک، محمد عرفان، رضوان قاسمی، صلاح الدین، نعیم عالم، علی عادل خاں، جاوید انور، محمد صادق، حاجی محمد شمیم، ریاض شمسی، محمد زبیر شیخ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر قمرالدین ذاکر کی دو کتابوں 'بزم انسانیت' اور 'ضیاء القمر' کا اجرا عمل میں آیا جبکہ محمودیہ پبلک اسکول کے بچوں کو مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی پر انعام بھی تقسیم کیے گئے۔ نظامت کے فرائض عطاء الرحمن اجملی نے ادا کیے اور تمام شرکا کا شکریہ محمودیہ پبلک اسکول کے منیجر حافظ شکیل نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 فروری 2025

ریڈیو اور اردو ادب

نئی دهلی: اردو ادب کے فروغ میں ریڈیو کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ریڈیو کے توسط سے ایسے ادیب و شاعر ادبی دنیا میں جلوہ گر ہوئے جنھیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ورلڈ ریڈیو ڈے کے موقعے پر منعقد مذاکرہ میں مقررین نے کیا۔ ادبی و ثقافتی تنظیم 'اظہار خیال' کے زیر اہتمام تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر میں منعقد مذاکرہ کی صدارت تسمیہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے کی جب کہ سابق نیوز ریڈر زاہد علی خاں، سابق اناؤنسر ایس ایم شفیق، آل انڈیا ریڈیو ایکسٹرنل سروس کے پروگرام ایگزیکٹو مبین احمد اور ثروت عثمانی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ دیگر اہم شرکا میں شمیم عثمانی، ریشمہ فاروقی، صائمہ، ایم اے کلام وغیرہ شامل تھے۔ نظامت شمیم عثمانی نے کی۔ اس موقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے زاہد علی خاں نے کہا کہ بلاشبہ ریڈیو اور ادب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم رہے ہیں۔ ایس ایم شفیق نے 'اظہار خیال' کے صدر اور سابق اناؤنسر عرفان اعظمی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ریڈیو کے توسط سے ملاقات اور اظہار خیال کا موقع فراہم کیا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس میں پروگرام ایگزیکٹو مبین احمد نے کہا ہر چند کہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے لیکن ریڈیو کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ ثروت عثمانی نے ریڈیو سے وابستہ اس وقت کی اہم ادبی شخصیات کو یاد کیا۔ مذاکرے کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے دور جدید میں بھی ریڈیو کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی بڑی تعداد میں لوگ ریڈیو کے پروگراموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس سے قبل اظہار خیال کے صدر عرفان اعظمی نے ریڈیو پر ملازمت کے دوران اہم امور پر روشنی ڈالی۔ دریں اثنا اس موقعے

پر ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی جس کی صدارت زاہد علی خاں اثر نے کی اور اور شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت عرفان اعظمی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2025

محفلِ کلامِ غالب

نئی دهلی: وزارت ثقافت حکومت ہند کے تعاون سے غالب کے 156 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 56 ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے غالب اکیڈمی نئی دہلی میں محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر بیگم اختر کی سب سے کم عمر شاگردہ سینئر غزل سنگر ریکھا سوریہ نے کہا کہ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں صوفیانہ عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام موضوعات پر بھی شعر کہے گئے ہیں، غالب کی عشقیہ غزلیں گانے کے لیے بہت موزوں ہوتی ہیں۔ جیسس میری کالج کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر انوپما سریواستو نے مترنم آواز میں غالب کی کئی غزلیں پیش کیں۔ سامعین نے اسے بغور سنا اور خوب داد دی۔ طبلے پر تنویر احمد خان اور ہارمونیم پر منیش شرما اور گٹار پر شمی نے ساتھ دیا۔ اس موقعے پر غالب اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے زمانے میں موسیقی کا رواج تھا، خود غالب کی غزلیں ان کے زمانے میں گائی جاتی تھیں۔ اس پروگرام کی نظامت کشفی شمائل نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 فروری 2025

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں اختراعی طریقہ تدریس

نئی دهلی: اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'قومی تعلیمی پالیسی دو ہزار بیس کے تناظر میں اختراعی طریقہ تدریس' کے موضوع پر آن لائن خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ شعبۂ تعلیمی مطالعات، فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر آفاق ندیم خان نے یہ خطبہ دیا تھا۔ اساتذہ معلمین اور ریسرچ اسکالروں کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں میں اردو تدریس کے فرائض انجام دینے والے اساتذہ خطبے میں شامل ہوئے۔ پروفیسر جسیم احمد، اعزازی ڈائریکٹر، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اکادمی کی طرف سے شروع کیے گئے آن لائن لیکچر سیریز کے متعلق جو گزشتہ دو ماہ سے جاری ہے اور یہ تیسرا لیکچر ہے اس سلسلے میں شرکا کو بتایا۔ پروفیسر احمد نے تدریس و آموزش کے ایسے اختراعی طریقے وضع کرنے کی ضرورت اجاگر کی جو طلبہ کے لیے لچک دار، دلچسپ اور مسرت بخش ہو۔ آن لائن لیکچر سیریز کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر نوشاد عالم، مترجم، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے خطبے کے لیے مدعو مہمان مقرر کا سامعین سے تعارف کراتے ہوئے ان کی علمی حصولیابیوں کا مختصر لیکن جامع خاکہ پیش کیا۔ مہمان مقرر ڈاکٹر ندیم نے قومی تعلیمی پالیسی دو ہزار بیس کے تناظر میں کلاس روم تدریس و آموزش میں اختراعی طریقہ تدریس متعارف کرایا۔ نصابی معاملے کے ضمن میں انھوں نے کہا کہ معلمین کو کمرہ جماعت کی متنوع آبادی کے درمیان مساوات کی ضرورت کا احساس بہر حال ہونا چاہیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، 4 مارچ 2025

اردو زبان و ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر

نئی دهلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبۂ اردو میں بزم ادب کے زیر اہتمام علمی، ادبی و ثقافتی تقریب کا انعقاد ہوا، جس میں خصوصی لیکچر، بین الکلیاتی (انٹر کالج) بیت بازی اور غزل سرائی کے مقابلے شامل تھے۔ خصوصی لیکچر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاذ پروفیسر مشتاق قادری نے دیا۔ صدر شعبہ و بزم ادب ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ نے مقرر خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور 'اردو زبان و ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر' کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے وقت کی ضرورت قرار دیا۔ پروفیسر قادری نے اپنی تقریر میں اردو زبان کی ہمہ گیری اور قومی یکجہتی میں نمایاں کردار پر بصیرت افروز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ زبان دلوں کو جوڑتی ہے، تہذیبوں کو قریب لاتی ہے اور انسانیت کا پیغام عام کرتی ہے۔ لیکچر کے بعد تقریب کے دوسرے حصے میں بین الکلیاتی انٹر کالج بیت بازی اور غزل سرائی کے مقابلوں کا آغاز ہوا، جن میں مختلف کالجوں کی ٹیموں نے بھرپور جوش و خروش کے ساتھ شرکت کی۔ تقریب کے اختتام پر صدر محفل ڈاکٹر محمد اعلم شمس نے مقرر خصوصی پروفیسر قادری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے خطاب کو سراہا۔ پروگرام کی نظامت سال سوم کی طالبہ رمشا آصف اور سال اول کی طالبہ رخشندہ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2025

ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دهلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام یک روزہ ریسرچ اسکالرز سمینار کا انعقاد خواجہ احمد فاروقی لائبریری میں کیا گیا۔ اس سمینار میں کلیدی خطاب پروفیسر

معین الدین جینابڑے نے پیش کیا اور سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد اشرف نے کی۔ اس موقعے پر مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ اردو کے صدر معروف ناقد و شاعر پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو چاہیے کہ وہ ادب کے مطالعے کے ساتھ اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کی بھی عادت اور صلاحیت پیدا کریں۔ اپنے کلیدی خطاب میں معروف افسانہ نگار و ناقد پروفیسر معین الدین جینابڑے نے تحقیق کی اہمیت و افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ادب دو خانوں میں منقسم ہے ایک تحقیق اور دوسرا تنقید، تنقید کے لیے ندرت شرط ہے۔ جب آپ کے پاس سوال اور فکر نہیں ہے تو آپ کچھ نہیں لکھ سکتے۔ سمینار کے پہلے اجلاس میں سات مقالے پیش کیے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ریسرچ اسکالر درخشاں، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد امجد، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز محمد فیصل خان، تسنیم عابد، ساجد انصاری، محمد نوید اور مصری ریسرچ اسکالر یاسمین جابر محمد نے اردو شاعری میں انسان دوستی کے عناوین پر مقالات پیش کیے۔

اس اجلاس کے صدارتی خطبے میں پروفیسر خالد اشرف نے مقالہ نگاروں کے تلفظ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے مفید مشورے دیے۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نورین علی حق نے کی اور

اجلاس کے آخر میں شعبے کے استاذ ڈاکٹر احمد امتیاز نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت ذاکر حسین دلی کالج (شبینہ) کے پروفیسر مظہر احمد اور شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کی۔ اس اجلاس میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر عبدالوارث، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر سیف الرحمان، اگنو کے ریسرچ اسکالر محمد عمر، دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز محمد شاہ رخ عبیر، عبدالرزاق، تنویر احمد، میسرہ اختر نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محمد تجمل حسین نے کی۔ سمینار کے دوسرے اور آخری اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے شعبے کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کہا کہ مقالہ پیش کرنے سے قبل اپنے دوستوں اور اساتذہ کو اپنے مقالے ضرور سنایا کریں، اس عمل سے اصلاح کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر مظہر احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ گھبرانے کی نہیں مطالعہ اور افہام و تفہیم میں تسلسل کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے سب سے بڑے تانیثی افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی تھے۔ پروگرام کے آخر میں شعبہ اردو کی استاذ پروفیسر ارجمند آرا نے شکریہ ادا کیا۔ تمام مقالہ نگاروں کو سند سے بھی نوازا گیا۔ اس ریسرچ اسکالرز سمینار میں شعبہ اردو کے اساتذہ کے علاوہ طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرز اور دیگر شعبے کے اساتذہ و طلبا نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 مارچ 2025

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: تمام تر مواصلاتی اور نقل و حمل کے وسائل کی ترقیات کے باوجود ہجرت کا زخم اب بھی تازہ ہے

اور اس کے لیے دنیا ہنوز کوئی مرہم نہیں بنا سکی ہے۔ ہجرت کی پیچیدگیاں اور اس کے مسائل ہمہ جہت ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ہجرت نے انسانیت کو ذہنی، فکری اور نظری وسعت کا تحفہ بھی عطا کیا۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام 'سجاد ظہیر یادگاری خطبہ' پیش کرتے ہوئے کینیڈا میں مقیم ممتاز ڈرامہ نگار اور داستان گو جاوید دانش نے کیا۔ صدارتی کلمات میں صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ جاوید دانش نے ہجرت کے کرب کو نصف صدی تک جھیلا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی اس غریب الوطنی کے اندوہ کو ضائع نہیں ہونے دیا، بلکہ اس کو اپنے تخلیقی سانچے میں ڈھال کر شاہکار مہجری ادب سے اردو کی ادبی دنیا کو مالا مال کیا۔ ان کے ڈراموں کے مجموعے 'ہجرت کے تماشے' کو مہجری ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام سالانہ 'سجاد ظہیر یادگاری خطبہ' کی ایک پروقار اور زریں علمی روایت رہی ہے۔ ماضی میں یہ خطبات ملکی اور عالمی سطح کے ممتاز علما اور دانشوروں نے پیش کیے ہیں۔ 'سجاد ظہیر یادگاری خطبہ' کے کنوینر پروفیسر عمران احمد عندلیب تھے۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر سید تنویر حسین کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2025

ہندوستان اور مصر کے تعلقات کے فروغ میں اردو کا کردار

نئی دھلی: شعبۂ اردو ستیہ وتی کالج دہلی یونیورسٹی میں 'ہندوستان اور مصر کے تعلقات کے فروغ میں اردو زبان و ادب کا کردار' پر ایک توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں مہمان مقرر کی حیثیت سے ڈاکٹر یاسمین جابر محمد حسن، استاذ شعبۂ اردو، ازہر یونیورسٹی، قاہرہ مصر نے خطاب کیا۔ پروگرام کا آغاز پروفیسر شیخ عقیل احمد، صدر شعبۂ اردو کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے ہندوستان اور مصر کی صدیوں پرانی تہذیبی، ثقافتی روایات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پرنسپل پروفیسر سجاش کمار سنگھ نے کالج کے شعبۂ اردو کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر یاسمین جابر محمد حسن نے اپنے توسیعی خطبے میں ہندوستان اور مصر کے تعلقات کے فروغ میں اردو زبان کے اہم کردار پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر قمر الحسن نے بھی ہندوستان اور مصر کے تعلقات پر خطاب کیا۔ ڈاکٹر عارف اشتیاق نے نظامت کی اور ڈاکٹر فخر عالم نے اظہار تشکر کیا۔ اس پروگرام میں کالج کے متعدد طلبہ و طالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2025

ادبی متن اور ترجمے کا عمل

نئی دھلی: ترجمہ ایک نئے علمی، فکری، نظریاتی اور تہذیبی خطے کو فتح کرنے سے عبارت ہے۔ ترجمہ اپنے مطالعے میں کسی کو شریک کرنے کا عمل ہے۔ ترجمہ صرف لفظوں کا نہیں ہوتا بلکہ متن میں جو فضا ہوتی ہے، دھڑکتا ہوا سماج ہوتا ہے، ایک کامیاب ترجمہ اس کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ میرے لیے ترجمے کا عمل دنیا کو سمجھنے، لوگوں کو سمجھنے اور ان کی جبلتوں کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور اسی کے ذریعے ہم خود کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ توسیعی خطبے میں معروف ترجمہ نگار پروفیسر ارجمند آرا (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے 'ادبی متن اور ترجمے کا عمل' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ صدارتی کلمات میں صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ ترجمے پر یہ خطبہ اس لیے بھی وقیع ہے کہ خود مقرر بیس برسوں سے زائد عرصے سے ترجمہ کر رہی ہیں۔ علمی اور کاروباری ترجمہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن ادبی متون کا ترجمہ صرف دو زبانوں پر دسترس کا ہی متقاضی نہیں، بلکہ متعلقہ موضوع اور تہذیبی انسلاکات سے وابستہ ہوتے ہوئے بھرپور تخلیقی شان کے ساتھ متن کی کیفیت اور فضا کو منتقل کرنے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ اور اس عمل کے لیے ترجمہ نگار کو متن کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ اس توسیعی خطبے کے کنوینز ڈاکٹر مشیر احمد تھے، جنھوں نے ارجمند آرا کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے استقبال اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر نوشاد منظر کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2025

داستان نویسی

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک توسیعی خطبے کا انعقاد شعبہ کے ایرانولوجی ہال میں عمل میں آیا، جس کے مقرر خاص مشہور داستان نویس مصطفی مستور ایرانی تھے۔ صدارت پروفیسر سید کلیم اصغر صدر شعبۂ فارسی نے کی جب کہ فریدالدین فرید عصر کلچرل کونسلر اور قمبر سلیمان ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ مصطفی مستور نے اپنی تقریر میں کہا کہ داستان میں زندگی کا عکس ہوتا ہے۔

ایک داستان نویس اس میں زندگی کے تجربات پیش کرتا ہے، جو ہمارے ذہن و دماغ کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی فریدالدین فرید عصر نے کہا کہ موصوف کی ایک کتاب کے ساڑھے سات لاکھ نسخے چھپ چکے ہیں، جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قہرمان سلیمانی نے موصوف کے کام اور کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر سید کلیم اصغر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے مقرر کی کہانیاں ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے مگر آج وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ایک کتاب کے تقریباً سو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ہمارے طلبہ کو ان کی کتابیں پڑھنی چاہئیں اور ان کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہیے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر زہرا خاتون کوآرڈی نیٹر توسیعی خطبات نے کی اور مہمانوں کا مختصر تعارف کرایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 فروری 2025

اردو اور نئی نسل

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں شعبۂ اردو اور شمع ایجوکیشنل اینڈ پولی ٹکنک سوسائٹی کے باہمی اشتراک سے ایک پروگرام بعنوان 'اردو اور نئی نسل' منعقد کیا گیا جس میں ملک و ملت کی نامور شخصیات، سماجی کارکنان، ادب نواز دوستوں کے ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں دہلی یونیورسٹی کے مختلف کالجز کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور مقررین و شعرا کے کلام سے محظوظ ہوئے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنے بھیجے گئے پیغام میں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پروفیسر دنیش کھٹر پرنسپل کروڑی مل کالج نے کہا کہ اردو ہمارے یہاں آنرز کورس کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرح کے پروگرام شعبۂ اردو کے ذریعے اکثر منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر شاہد چنگیزی نے کہا کہ یہ زبان محبت کی زبان ہے اسے مذہبی رنگ دینا اس کی روح کو تکلیف دینے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی نے اردو زبان کو ہندوستانی تہذیب کا استعارہ قرار دیا۔ آخر میں پروگرام کے اختتامی کلمات ڈاکٹر مجیب احمد خان نے ادا کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 فروری 2025

فکشن کی تکنیک

نئی دہلی: فکشن کی تخلیق، استحکام اور توانائی میں تکنیک کا اہم دخل ہوتا ہے۔ فکشن خارج کی تصدیق سے بے نیاز ہوتا ہے۔ داستان زبانی بیانیہ کا فن ہے اور اس کی بنیاد تخیل پر قائم ہوتی ہے، جب کہ ناول اور

افسانہ تعقل پر مبنی ہے۔ فکشن کی تکنیک پر راوی کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خودکلامی، آزاد تلازمۂ خیال، شعور کی رو، حقیقت نگاری، ماورائے حقیقت نگاری، جادوئی حقیقت نگاری، فلیش بیک، علامتیت، تجریدیت، اوپن اینڈیڈ اور کلوز اینڈیڈ کہانی، اساطیریت، سہ ابعادی تکنیک، فنتاسی، اظہاریت، ملفوظاتی تکنیک، تمثیلی تکنیک، ڈائری، خط اور آپ بیتی کی تکنیک فکشن کی اہم تکنیکیں ہیں۔ فکشن کا زور بیان کے بجائے بیانیہ پر ہوتا ہے۔ بیانیہ وقت کی تبدیلی سے وابستہ ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ توسیعی خطبہ 'فکشن کی تکنیک' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اور معروف ادیب و شاعر پروفیسر ابوبکر عباد نے کیا۔ صدارتی خطاب میں صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ یہ خطبہ صحیح معنوں میں اطلاقی تنقید کا بہترین نمونہ تھا۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے فکشن کی تکنیک سے متعلق تمام نظری مباحث کو فکشن کے متون پر منطبق کر کے جس سلیقے سے پیش کیا، اس سے طلبہ کو ہی نہیں بلکہ اساتذہ کو بھی فیض یابی کا موقع ملا۔ اس توسیعی خطبے کے کنوینر ڈاکٹر خالد مبشر نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ابوبکر عباد کا تعلق ایک موقر علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ عہد حاضر میں ان کی فکشن تنقید گوناگوں معنویت و افادیت سے معمور ہے۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر جاوید حسن کے اظہار تشکر پر ہوا۔

بحوالہ قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 28 فروری 2025

اردو زبان اور روزگار کے مواقع

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبۂ اردو کی لٹریری سوسائٹی 'بزم ادب' کے زیر اہتمام 'اردو زبان اور روزگار کے مواقع' کے موضوع پر ایک ڈپارٹمینٹل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ 'ایس سی ای آر ٹی' کے ریسورس پرسن ڈاکٹر علام الدین نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ نے نظامت کی اور مہمان مقرر کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس پروگرام اور موضوع کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے عملی زندگی میں اردو زبان کے پیشہ ورانہ امکانات سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر علام الدین نے اپنے لیکچر میں ہندی اور انگریزی کے مقابلے میں اردو کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے اردو زبان کی شیرینی، اس کے تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں اور اس کے وسیع تر روزگار کے امکانات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں اردو کے لیے بے شمار مواقع موجود ہیں جیسے کنٹینٹ رائٹنگ، بلاگنگ، ڈائیلاگ اور اسکرپٹ رائٹنگ، ترجمہ نگاری اور انٹرپریٹیشن وغیرہ۔ انھوں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ دسویں جماعت کے بعد ہی (ایس ایس سی) اور دیگر مسابقتی امتحانات میں حصہ لے کر اپنے کریئر کی سمت متعین کریں، بجائے اس کے کہ وہ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد روزگار کے بارے میں سوچیں۔ پروفیسر محمد جعفر احراری نے مہمان مقرر کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے ان کے خطبے کو سراہا اور طلبہ کو اس میں پیش کیے گئے نکات پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ پروگرام میں شعبے کے استاذ اور منعقدہ لیکچر کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر محمد اسلم شمس نے مقرر خصوصی، تمام اساتذہ، مہمانانِ گرامی اور طلبہ و طالبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اردو زبان کی خوبصورتی پر چند ذاتی تجربات و مشاہدات بھی پیش کیے نیز اردو زبان و ادب کی مشترکہ تہذیب کے تحفظ اور اردو کی ترویج و ترقی کے عزم کو دہرایا۔ پروگرام میں اردو آنرز و پروگرام کے طلبہ سمیت مختلف شعبوں کے طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2025

طنز ومزاح کی مبادیات

نئی دہلی: ہونٹوں سے ہنسی کا چھن جانا عہد حاضر کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ معاشرے کی سنجیدگی اور ہنسی دونوں مصنوعی ہوگئی ہیں۔ ہنسی کی صلاحیت خدا کی ایک عظیم نعمت ہے۔ ہنسی جب ادبی اظہار کے قالب میں نمو پاتی ہے تو مزاح پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کی ناہمواریاں طنز ومزاح کی بنیادی محرک ہیں۔ مضحک صورت واقعہ، مضحک کردار، تحریف، قول محال اور مبالغہ آمیز بیان طنز ومزاح کے اہم حربے ہیں، ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'طنز ومزاح کی مبادیات' کے موضوع پر پروفیسر مظہر احمد (ذاکر حسین کالج شبینہ) نے توسیعی خطبے میں کیا۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام سالانہ یادگاری اور توسیعی خطبے کی ایک زریں روایت رہی ہے، چنانچہ اس ہفتے مستقل ممتاز ادیب اور دانشوروں کی آمد اور ان کے وقیع خطبات کا سلسلہ جاری ہے۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر شہزاد انجم نے مہمان مقرر کی علمیت اور خطبے کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ بہترین خلاقی کا مظہر ہونے کے باوجود طنز ومزاح کے سرمائے کو سنجیدہ مطالعے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا ہے۔ توسیعی خطبے کے کنوینر ڈاکٹر شاہ عالم نے خطبے کے موضوع کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر ثاقب عمران کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر اور طلبا وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ2025

ہندوایران کی داستانیں

نئی دہلی: شعبۂ فارسی ذاکر حسین دہلی کالج میں بعنوان 'ہند و ایران کی داستانیں' ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس خطبے کے لیے بحیثیت مقرر سینئر پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کو مدعو کیا گیا۔ جلسے کی صدارت شعبۂ فارسی، ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق استاذ ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے کی۔ ڈاکٹر جمشید خان نے اس پروگرام کی نظامت کی۔ پروفیسر علیم اشرف خان نے اپنے خطبے میں 'ہند و ایران کی داستانیں' موضوع پر نہایت ہی مفصل گفتگو کرتے ہوئے سامعین کو اپنی تقریر سے مستفید کیا۔ دوران تقریر موصوف نے پنچ تنتر سے لے کر الف لیلہ، سنگھاسن بتیسی، پدماوت، لیلیٰ و مجنوں، ہیر رانجھا، شیریں و فرہاد، سسی پنوں، شاہنامہ، مرزبان نامہ، کلیلہ و دمنہ، باغ و بہار وغیرہ جیسی معروف داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے داستان کی اہمیت اور ہماری زندگی میں اس کی کیا افادیت ہے اس پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے اپنے صدارتی کلمات میں داستان گوئی کی اہمیت اور ارتقا پر بھی گفتگو کی اور بتایا کہ داستان کیسے ہمارے سماج میں مثبت اثر رکھتی ہے۔ اس پروگرام میں کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام ہماری زندگی میں کافی اہمیت رکھتے ہیں، خاص طور سے طلبہ ایسے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ انھوں نے اس موقعے پر مشورہ دیا کہ بچوں کو اپنے کورس کے دوران کچھ اسکل بیسڈ کورس بھی کرنے چاہئیں۔ اس پروگرام میں کثیر تعداد میں طلبہ واساتذہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2مارچ2025

منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دہلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ منشی نول کشور یادگاری خطبے میں معروف ادبی نقاد اور دانشور پروفیسر انور پاشا نے 'منٹو کی جمالیات' کے عنوان سے ایک پرمغز اور فکر انگیز خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں جمالیات کے نظری مباحث اور سعادت حسن منٹو کے جمالیاتی پہلوؤں کو انتہائی گہرائی اور بصیرت کے ساتھ پرکھا۔ انھوں نے منٹو کی تحریروں میں پوشیدہ انسانی نفسیات، معاشرتی تضادات، طبقاتی تصادم اور معاشرے کی حقیقی صورت حال کو اجاگر کرنے کی منفرد صلاحیت پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ منٹو کے حسن جمال کی گردش کا محور ذات انسان اور جوہر انسان کے عرفان پر ہے۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے صدارتی خطاب میں موضوع پر مہمان مقرر کی گرفت اور موضوع کے قابل فہم اظہار کی ستائش کی۔ صدر شعبہ نے طلبہ کو شکیل الرحمٰن کی کتاب 'منٹو شناسی' کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا اور منٹو فہمی کے حوالے سے اس کتاب کو بے حد اہم قرار دیا۔ اس یادگاری خطبے کے کنوینر پروفیسر سرور الہدیٰ نے نظامت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ خطبے کے آغاز میں منشی نول کشور کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی اور اشاعتی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے مہمان مقرر کا بھی تفصیلی تعارف پیش کیا۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر مشیر احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس خطبے میں شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3مارچ2025

اردواور فارسی شاعری کا ادبی ولسانی رشتہ

نئی دہلی: سنسکرت فارسی زبان کی بہن ہے۔ متعدد الفاظ کے تلفظ اور معانی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی زبان کا ہندوستانی تہذیب وثقافت سے اس قدر اہم رشتہ ہے کہ اسے غیر ملکی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ فارسی ہندوستان میں محمود غزنوی کے ساتھ آئی، بلکہ وہ پہلے سے برصغیر میں موجود تھی۔ اردو، ہندی اور اس کی شیلیوں میں ابتداءً فارسی تراکیب، استعارے اور تشبیہات کے علاوہ فارسی کے یکتائے زمانہ شعرا کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اردو فارسی شاعری کا ادبی ولسانی رشتہ' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے فارسی کے معروف ادیب وشاعر پروفیسر اخلاق احمد آہن (شعبۂ فارسی، جے این یو) نے کیا۔ صدارتی کلمات میں صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ مہمان مقرر کی گفتگو تحقیقی ہوتے ہوئے مربوط، مبسوط اور رواں تھی۔ ان کے اس خطبے میں بھرپور علمیت کے ساتھ معروضیت، استدلال اور منطقیت کی ہم آہنگی مثالی ہے۔ خطبے کے کنوینر پروفیسر شہزاد انجم نے مہمان مقرر اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے خطیب کا مفصل تعارف بھی پیش کیا۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر محمد آدم کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ2025

عربی زبان کا لسانیاتی ارتقا

نئی دہلی: شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ایک اسپیشل لیکچر 'عربی زبان کا لسانیاتی ارتقا: بنیاد اور استعمال کے حوالے سے' کے عنوان پر منعقد ہوا۔ شیخ ڈاکٹر

محمد سلیمان المفدی ڈائرکٹر جنرل دارآفاق المعرفہ، ریاض مملکت سعودی عرب بطور خصوصی مقرر شریک ہوئے۔ صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق چیئرمین اور استاد پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے جب کہ نظامت پروفیسر عبیدالرحمٰن نے کی۔ لیکچر کا آغاز شعبہ کے سابق چیئرپرسن پروفیسر رضوان الرحمٰن کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ افتتاحی خطاب اسکول آف لینگویج کی ڈین پروفیسر شوبھا شیواشنکرن نے پیش کیا۔ شیخ ڈاکٹر محمد سلیمان المفدی نے اپنے خطاب میں ’عربی زبان کا لسانیاتی ارتقا‘ پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے سب سے پہلے کسی بھی لفظ کے مادہ (جذر) کے مفہوم کو بیان کیا، جو کہ عربی زبان کی بنیاد ہوتی ہے۔ شیخ المفدی نے زبان عربی کے استحکام کو بھی تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ عربی زبان کی پائیداری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ برطانوی آرکائیوز میں موجود کئی تاریخی دستاویزات عربی میں دستیاب ہیں۔ لیکچر کے اختتام پر سوال و جواب کا سیشن ہوا، جس میں شرکا نے عربی لسانیاتی ارتقا اور قدیم متون کی تفہیم پر سوالات کیے۔ شیخ المفدی نے ان تمام سوالات کا بالتفصیل جواب دیا۔ صدر جلسہ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے بھی اظہار خیال کیا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ شعبۂ عربی کے اساتذہ، طلبا اور ریسرچ اسکالرز کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ لیکچر کا اختتام ڈاکٹر محمد اجمل کے کلمات تشکر سے ہوا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 13 فروری 2025

امیر خسرو پر توسیعی خطبہ

نئی دهلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک توسیعی خطبے کا انعقاد شعبہ کے ایرانولوجی ہال میں عمل میں آیا جس کے مقرر خاص مشہور دانشور اور مورخ پروفیسر سید عزیزالدین حسین ہمدانی، سابق صدر شعبہ تاریخ و ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور تھے۔ صدارت پروفیسر سید کلیم اصغر صدر شعبۂ فارسی نے کی، جب کہ بین الاقوامی المصطفیٰ یونیورسٹی کے ہندوستان میں سربراہ ڈاکٹر سید کمال الدین حسینی نے مہمان اعزازی اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے سجادہ نشین سید محمد نظامی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ پروفیسر عزیز الدین نے امیر خسرو کے کلام میں موجود فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر سید کمال الدین حسینی نے مذکورہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وحدت کے اصل معانی تبدیلی مذہب نہیں بلکہ رفع اختلافات اور ہم زیستی کے ہیں۔ مہمان خصوصی سید محمد نظامی نے کہا کہ امیر خسرو کا ہندوی اور فارسی کلام ایک مشن تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان، انسان کو جانے اور ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی رکھے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر زہرہ خاتون کوآرڈی نیٹر توسیعی خطبات نے کی اور مہمانوں کا مختصر تعارف کرایا۔ پروگرام کے آخر میں صدر شعبۂ فارسی پروفیسر سید کلیم اصغر نے تمام مہمانان و حاضرین جلسے کا شکریہ ادا کیا۔ اس خطبے میں بڑی تعداد میں طلبا و طالبات نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 11 فروری 2025

یومِ غالب

نئی دهلی: غالب کے یوم وفات کی مناسبت سے انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب میں یوم غالب کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت جاوید دانش (کنیڈا) نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ غالب کا خمار لوگوں پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ ہر شعر کو غالب سے منسوب کردیتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ یوم غالب پر غالب کو یاد کرنا صرف ایک شاعر کو خراج عقیدت نہیں ہے بیا پنی تہذیب سے وابستگی بھی ہے۔ ہمالیہ ڈرگس کے صدر جناب ایس فاروق نے کہا کہ غالب کا مطالعہ ہمیں زبان کی باریکیوں سے واقف کراتا ہے۔ جناب ایڈوکیٹ عبدالرحمٰن نے کہا کہ غیر اردو داں طبقے میں غالب جس طرح پہنچے ہیں اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ اردو میں غالب تنقید کو پڑھنے سے ہماری پوری تنقیدی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ غالب نے اگرچہ اپنی اردو شاعری کو فارسی کی نسبت کمتر کہا ہے لیکن اگر وہ واقعی اسے کمتر سمجھتے تو بار بار اس کی اشاعت نہ کرواتے۔ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے جوائنٹ سکریٹری خورشید عالم نے کہا کہ غالب نے کہا تھا کہ میری قدر میرے بعد ہوگی لیکن ان کے زمانے میں بھی ان کی قدر کم نہیں ہوئی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کا دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار شائع ہوا۔ محترمہ ہاجرہ منظور نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو دلی شاخ ہر سال یوم غالب کا اہتمام کرتی ہے اور اس موقعے پر آپ لوگوں کی شرکت اسے باوقار بنادیتی ہے۔ اس اجلاس میں مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ Echoes of Dreams کی رونمائی بھی ہوئی۔ افسانوں کی مترجم ڈاکٹر تاریکا بھی اس موقعے پر موجود ہیں۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ظفر مرادآبادی نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرے کے بعد شام غزل کا اہتمام ہوا جس میں استاد یوسف خاں نظامی نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 16 فروری 2025

یونانی طب سے اردو کا لسانی رشتہ

نئی دهلی: آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں یک روزہ قومی سمینار بعنوان ’یونانی طب سے اردو کا لسانی رشتہ‘ کا انعقاد عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطاب میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ طب یونانی اور اردو کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو زبان اور خصوصاً شاعری میں ان رشتوں کے بے شمار روشن نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ ہماری کلاسیکی ادبیات میں جگہ جگہ طب یونانی کا ذکر اور اس سے اخذ و استفادہ کی متعدد صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سمینار کا مقصد یونانی طب اور اردو زبان کے مابین تاریخی و لسانی تعلق کو اجاگر کرنا تھا، تاکہ طب یونانی کی علمی روایت کو مستحکم کیا جاسکے اور اردو زبان کے ذریعے اس کے فروغ کے امکانات پر غور کیا جائے۔ مقررین نے یونانی طب کی عربی، فارسی اور اردو روایات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو نے یونانی طب کو عوام تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر خالد صدیقی نے حاضرین اور مندوبین کا استقبال کیا۔ حکیم فخر عالم نے سمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ سمینار کے مختلف سیشنز میں یونانی طب کے تاریخی متون، اردو میں طبی لٹریچر

اور جدید دور میں اس کی تدریسی و تحقیقی حیثیت پر مقالے پیش کیے گئے۔ مقررین نے سفارش کی کہ یونانی طب کے قدیم و جدید ذخائر کو اردو زبان میں مزید منظم اور ڈیجیٹلائز کیا جائے تاکہ نئی نسل کو اس سے بھرپور فائدہ پہنچ سکے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر بدرالدجی خاں اور ڈاکٹر محمد محسن نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر اشہر قدیر، ڈاکٹر افصح الکلام، ڈاکٹر مستحسن، فیض الرحمٰن، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت حکیم اشہر قدیر، ڈاکٹر شبیر احمد، ڈاکٹر شاہ عالم نے کی جبکہ ڈاکٹر احمد سعید، حکیم فخر عالم، پروفیسر عبدالحلیم، حکیم نازش احتشام اعظمی، حکیم مصباح الدین اظہر، ڈاکٹر صفی الرحمٰن، ڈاکٹر اشفاق احمد، اور ڈاکٹر امان اللہ نے مقالے پڑھے۔ پروگرام میں علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور دہلی یونیورسٹی کے طلبا واساتذہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 فروری 2025

مملوک العلی لیکچر

نئی دهلی: شعبۂ عربی ذاکر حسین دہلی کالج کے زیر اہتمام مقابلۂ خطاطی اور ساتویں مملوک العلی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر زرنگار نے کہا کہ ادب اپنے عہد کی ثقافت اور معاشرے کی کیفیت کا آئینہ اور ترجمان ہوا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ شعبۂ عربی ہر سال اپنے دوسرے تعلیمی سیمسٹر میں شعبے کے مشہور استاذ اور صدرالمدرسین مولانا مملوک العلی نانوتوی سے موسوم ایک یادگاری لیکچر کا انعقاد کرتا ہے، یہ لیکچر اس سلسلے کی ساتویں کڑی تھا۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر عبدالملک نے لیکچر سیریز کے مختصر تعارف کے ساتھ مہمان محاضرہ کی علمی وادبی نشو ونما اور تدریسی و تالیفی خدمات پر روشنی ڈالی۔ مہمان محاضرہ نے تقریباً ایک گھنٹے پر مشتمل 'عربی زبان وادب میں خواتین کے منظرنامے' کے عنوان پر ایک وقیع اور علمی محاضرہ پیش کیا۔ ساتھ ہی شعبے کے استاذ ڈاکٹر عبیداللہ نے شعرو شاعری کے تعلق سے اسلامی ہدایات اور عہد اسلامی میں خواتین کے ذریعے عربی شاعری پر مختصر بیان کیا۔

محاضرے کے بعد صدر جلسہ کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے شعبے کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے طلبہ سے اپنے موضوعات سے متعلق تجرباتی ہنر سیکھنے، اور سماج کی ترقی میں اچھا کردار ادا کرنے جیسے نیک مشوروں سے نوازا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے شکریے کی تحریک پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 فروری 2025

چالیس بابا ایک چور'' کی رسمِ رونمائی اور ڈراما 'آٹزم' کی پیش کش

دهلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں گولڈن جوبلی تقریبات کے موقعے پر

10 فروری 2025 کو 'ملاقات' کے عنوان کے تحت ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں ممتاز مہجری ادیب اور معروف ڈراما نگار جاوید دانش کے ڈراموں کا مجموعہ 'چالیس بابا ایک چور' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ جاوید دانش کا نام اردو مہجری ڈراما نگاروں میں سرفہرست ہے۔ جاوید دانش تن تنہا صنف ڈراما کی دیار غیر میں آبیاری کر رہے ہیں۔ 'ان کلاس ڈراما' کے ذریعے نئی نسل میں اردو سے دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ کینیڈا میں درس و تدریس کے لیے ہیرٹیج ٹیچنگ' کا نظام متعارف ہے جس کے تحت موصوف اردو زبان وتہذیب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف نے اپنے خطاب میں مہجری ادب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دیار غیر میں مہجری ادیبوں کے لیے متعدد مسائل ہیں۔ ان مسائل سے مہجری ادیب باخبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے ڈراموں میں ان مسائل کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہاجر کس کرب سے گزر رہے ہیں۔ موصوف نے اپنا مشہور زمانہ ڈراما 'عید کا کرب' پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے مہجری ادب کے تخلیق کاروں پر بات کرتے ہوئے ڈرامے کی روایت اور جاوید دانش کی ڈراما نگاری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی جاوید دانش کا مشہور ڈراما 'ایک تھی روحی' کی پیش کش ہونی تھی، لیکن طلبا وطالبات کی خصوصی فرمائش پر انھوں نے 'آٹزم' کے موضوع پر ایک منفرد ڈراما پیش کیا۔ یہ موضوع اور پیش کش کے حوالے سے ایک منفرد ڈراما ہے۔ ریسرچ اسکالرس، طلبا وطالبات کی طرف سے مہجری ادب اور مہجری ڈرامے پر متعدد سوالات پوچھے گئے جس کا مہمانِ خصوصی نے بہت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس تقریب میں پروفیسر دیویندر کمار چوبے نے اپنے تاثراتی کلمات سے نوازا، جب کہ پروگرام کے کنوینر، ڈاکٹر نصیب علی نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو کے ریسرچ اسکالرس، طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد رکن الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، یونیورسٹی آف دہلی، 10 فروری 2025

ظفر کمالی کے اعزاز میں تقریب

نئی دهلی: ڈاکٹر ظفر کمالی ایک گوشہ نشین اور قلندر صفت محقق اور شاعر ہیں۔ انھوں نے کاروبار دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن بچا کر اپنی دوڑ اسلامیہ کالج،

سیوان سے خدا بخش لائبریری، پٹنہ تک رکھی۔ ان خیالات کا اظہار معروف محقق اور شاعر ڈاکٹر ظفر کمالی کی دہلی آمد کے موقعے پر دی ونکس فاؤنڈیشن اور ڈائنامک انگلش اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ اعزازی نشست کے صدارتی کلمات میں پروفیسر کوثر مظہری (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے کیا۔ ڈاکٹر امتیاز وحید (کولکاتا یونیورسٹی) نے کہا کہ میرے لیے ڈاکٹر ظفر کمالی ایک مشفق علمی مربی، مرشد اور استاذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر واحد نظیر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ ظفر کمالی کی شبیہ ایک سچے اور خالص عالم اور محقق کی ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ ظفر کمالی کی کئی جہتیں ہیں، لیکن ان کا اصل جوہر تحقیق اور جارحانہ طنز

میں کھلتا ہے۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان نے کہا کہ ظفر کمالی کی شخصیت ہماری نسل کے لیے منارۂ نور کا درجہ رکھتی ہے۔ اس موقعے پر سفیر صدیقی نے ظفر کمالی کی شخصیت پر مفصل مقالہ پیش کیا۔ صاحب اعزاز ڈاکٹر ظفر کمالی نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنی تعریف سننا میرے اوپر نہایت شاق گزرتا ہے۔ ایسی محفلوں میں میں اپنے کان بند کرلیا کرتا ہوں۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست کا بھی انعقاد ہوا جس کی نظامت آصف بلال نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 فروری 2025

غالب اور معاصرین غالب کے کلام میں تصوف

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام 'غالب اور معاصرین غالب کے کلام میں تصوف' کے عنوان سے سمینار منعقد کیا گیا۔ شاعر، نقاد، کالم نگار شمیم طارق نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ غالب کو تصوف سے فطری لگاؤ تھا مگر وہ نظریے کی حد تک تصوف کے شیدائی تھے۔ عملی سطح پر وہ تصوف کی مثال نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں میر، نظیر سے لے کر داغ دہلوی تک کا ذکر کیا۔ جے این یو کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ وید، اپنشد، گیتا، پران، دھرم، بھکتی، تیاگ، تپیا، نروان، گیان، عبادت، ریاضت، کشف، عرفان اور عشق یہ وہی راستے ہیں جن کو ہم تصوف اور روحانیت کہتے ہیں۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ غالب کی شاعری میں تصوف کی جمالیات اور حقیقت کی جستجو ایک ایسی گہری ہم آہنگی پیدا کرتا ہے جو قاری کو انتہائی حقیقی تجربے کی طرف لے جاتی ہے۔ ابوظہیر ربانی نے کلام غالب میں تصوف کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے فلسفہ اور تصوف کے مسائل سے غزل کا دامن وسیع کیا۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بہادر شاہ ظفر مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حساس دل شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اردو شاعری میں تصوف پر کچھ کہنے کے ساتھ خواجہ میر درد کا ذکر ناگزیر ہے۔ خواجہ میر درد کی محفلوں میں سماع کا انعقاد ہوتا تھا جس میں اس عہد کے نامور حضرات شرکت کرتے تھے۔ سمینار کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج تنہائی کا دور ہے۔ بچے ماں باپ سے جدا ہیں۔ صوفیا نے بگڑے ہوئے سماج کو سدھارنے کی کوشش کی۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر یامین انصاری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2025

آندھرا پردیش

اکیسویں صدی کا غیر افسانوی ادب: اردو، انگریزی اور جنوبی ہند کی زبانوں میں

گنٹور: شعبۂ اردو، آچاریہ ناگارجنا یونیورسٹی، گنٹور میں منعقدہ دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'اکیسویں صدی کا غیر افسانوی ادب: اردو، انگریزی اور جنوبی ہند کی زبانوں میں' مؤرخہ 27 اور 28 فروری 2025 کو منعقدہ دو روزہ کامیاب سمینار بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوا۔ اس سمینار کا افتتاح آچاریہ ناگارجنا یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر سمہا چلم نے کیا۔ افتتاحی اجلاس سے پروفیسر سید فضل اللہ مکرم، پروفیسر قاسم علی خان، پروفیسر رضوان الرحمٰن، پروفیسر سریش کمار اور پروفیسر محمد نثار احمد نے خطاب کیا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر سمہا چلم نے شعبہ اردو کی ستائش کی اور کہا کہ اردو دنیا کی قد آور شخصیات کو یہاں دیکھ کر خوشی ہورہی ہے۔ شعبہ اردو کی رابطہ کار ڈاکٹر شیخ شہباز نے سمینار کے اغراض و مقاصد پیش کیے۔ پروفیسر رضوان الرحمٰن نے غیر افسانوی ادب کی تاریخ اور عربی و اردو کے غیر افسانوی ادب کا جائزہ لیا۔ سمینار کا مرکز توجہ پروفیسر نسیم الدین فریس' سابق ڈین اور صدر شعبہ اردو' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کا کلیدی خطبہ رہا جس میں انھوں نے غیر افسانوی ادب کی تمام اصناف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔

سمینار کی پہلی نشست پروفیسر سید فضل اللہ مکرم اور پروفیسر محمد نثار احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترورکاڈ کیرلا، ڈاکٹر نشاط احمد عمری، ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ، ڈاکٹر محمد فیض اللہ، ڈاکٹر فاروق باشا عمری، شیخ ناگور ولی اور مستان ولی نے مقالات پیش کیے۔ اس نشست میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر سی فوزیہ نے انجام دیے۔

دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر امان اللہ اور ڈاکٹر شمس الدین ترورکاڈ نے کی۔ اس نشست میں شیخ نازیہ، شیخ شیما، بی بی عالیہ، عبد الرشید اور عبد الرزاق نے اپنے مقالے پیش کیے۔

تیسری نشست کی صدارت پروفیسر محمد نسیم الدین فریس اور پروفیسر قاسم علی خان نے کی جس میں سید فاطمہ بی، ڈاکٹر ای محمد انور حسین، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، ڈاکٹر محمد محبوب، سراج، ڈاکٹر نور اللہ اور ڈاکٹر الطیع اللہ شاہد نے مقالات پیش کیے۔ اس نشست میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر شبیر باشا نے انجام دیے۔

چوتھی نشست کی صدارت ڈاکٹر نشاط احمد عمری اور ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری نے کی۔ اس نشست کے مقالہ نگاران 'ڈاکٹر ظہیر دانش عمری، ستار فیضی کڈپوی، افروز بیگم، محمد نذیر مہک، ابوبکر صدیق قاسمی، حافظ ابوطلحہ عمری، اور شیخ خالد سعید عمری مدنی نے اپنے مقالات پیش کیے۔

دوسرے دن 28 فروری کو اردو، انگریزی اور تلگو کے لیے متوازی نشستیں منعقد ہوئیں۔ ڈاکٹر شمس الدین ترورکاڈ اور امام باشا نے صدارت کی اور مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر بی بی عائشہ، شیخ اکرام اللہ عمری اور دیگر اسکالرس اور طلبہ نے مقالے پیش کیے۔ متوازی نشستوں میں انگریزی اور تلگو میں بھی غیر افسانوی ادب پر گرانقدر مقالات پیش کیے گئے۔

وائس چانسلر پروفیسر گنگادھر راؤ نے اختتامی اجلاس کو خطاب کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر سریش کمار نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر رتنا شیلا منی نے شرکت کی۔ مہمان اعزازی پروفیسر جی اوما مہیشور راؤ اور ڈاکٹر کوی کوٹیشور لو نے خطاب

کیا۔ اختتامی نشست میں سامعین اور مقالہ نگاروں نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

رپورٹ: ڈاکٹر وصی بختیاری، گلور، 28 فروری 2025

اترپردیش

میرا بھارت مہان گنگا جمنی تہذیب کا نشان

متھرا: پروگرام کا آغاز نامور ادیب ڈاکٹر ظہیر حسن صاحب کی کتاب مرزا غالب اور جان کیٹس کا تقابلی مطالعہ کے اجرا سے ہوا۔ اس پروقار تقریب میں نامور شخصیات نے شرکت کی اور اپنی بصیرت افروز گفتگو

سے سامعین کو مستفید کیا۔ پروگرام کی صدارت جناب پروفیسر عقیل نے کی، جب کہ نائب صدر ایڈوکیٹ ناصر عزیز رہے۔ بچوں نے برقی اعظمی کا تحریر کردہ اسکول کا ترانہ پیش کیا، جس نے ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ اس کے بعد باضابطہ طور پر علمی و ادبی نشستوں کا آغاز ہوا، جس میں مختلف اسکالرز اور محققین نے مقالات پیش کیے۔ چشمہ فاروقی، ڈاکٹر محمد ایوب انصاری، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر ارشاد اور ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی نے تحقیقی و تنقیدی مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر اسسٹنٹ کمشنر جناب علیم کوثر نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور سمینار کی علمی و ادبی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس سمینار نے غالب کے فن اور اس کی عظمت کے راز کو سمجھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور حاضرین کو اردو ادب کے اعلیٰ معیار سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی نے سمینار میں پڑھے گئے تمام مقالات پر سیر حاصل گفتگو کی... ڈاکٹر شیخ عقیل نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''ہمارا ہندوستان ایک عظیم راشٹر ہے، جس کی ثقافت میں اتحاد اور بھائی چارے کی گہری جڑیں موجود ہیں۔ گنگا جمنی تہذیب ہماری ادبی، ثقافتی اور سماجی زندگی کا وہ حسین امتزاج ہے، جو مختلف مذاہب، زبانوں اور روایات کو ایک دھاگے میں پروئے رکھتا ہے۔'' اظہار تشکر محترمہ ڈاکٹر ناہید اختر نے کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 فروری 2025

تقسیم اسناد

بنارس: مدرحلیمہ سنٹرل اسکول کے زیر اہتمام، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ڈپلومہ ان اردو کورس کے کامیاب طلبا و طالبات کے لیے تقریب تقسیم اسناد کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر آفتاب احمد آفاقی بطور مہمان خصوصی اور جناب منظور عالم، پرنسپل، نیشنل انٹر کالج و عرفان حسن خاں بحیثیت مہمانان اعزازی شامل ہوئے۔ اس موقعے پر پروفیسر آفاقی نے اپنے خطاب میں اردو کی ادبی و تاریخی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور ہندی و اردو کے گرامر ایک ہیں۔ اس کی ترویج و اشاعت میں بلاتفریق مذہب و ملت سبھوں نے حصہ لیا ہے۔ آج اردو تعلیم یافتہ کے لیے محض درس و تدریس کے دروازے نہیں کھلے ہیں بلکہ صحافت، ترجمہ، قانون اور صوبائی اور قومی انتظامیہ سے متعلق بڑے عہدوں پر بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ آج الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں اردو والوں کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کی ہر بڑی یونیورسٹی میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی زبان پر دسترس حاصل کرلیں۔ اس سے قبل اسکول کے ڈائریکٹر جناب نعمان حسن خاں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنے ادارے کی تعلیمی و تربیتی سرگرمی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو ڈپلومہ کورس کی تدریس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے یہ اطمنان کی بات ہے کہ اردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ اسے سکھانا ہماری ترجیحات میں شامل ہے اور ہم نے ہزاروں طلبا و طالبات کو اپنے ادارے میں اردو سکھائی ہے۔ اس موقعے پر شبانہ عثمانی نے بھی اردو زبان کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض جناب عمران حسن خاں نے بحسن خوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، بی ایچ یو، وارانسی، 8 فروری 2025

اکیسویں صدی میں اردو ناول نگاری

میرٹھ: ناول ایک دستاویز ہوتا ہے۔ یہ تفریح کے لیے نہیں ہوتا۔ نئی نسل میں ناول لکھنے کے تعلق سے جلد بازی بہت ملتی ہے۔ ناول لکھتے وقت اس عہد کا خیال ضرور رکھنا چاہیے جس عہد میں ناول لکھا جا رہا ہے۔

یہ الفاظ تھے معروف فکشن نگار خالد فتح محمد کے جو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقدہ 'اکیسویں صدی میں اردو ناول نگاری' میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ناقد اور سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان ذی وقار کے بطور معروف فکشن نگار عبدالصمد، نورالحسنین اور ڈاکٹر صادقہ نواب سحر شریک ہوئے۔ مفتی راحت علی صدیقی اور سرتاج جہاں نے بطور مقالہ نگار پروگرام میں شرکت کی۔ مقرر کے بطور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین پروگرام میں آن لائن موجود رہیں۔ استقبالیہ کلمات بی اے آنرز کے طالب علم محمد ندیم، نظامت کے فرائض ایم اے سال دوم کے محمد ارشد اور شکریے کی رسم ریسرچ اسکالر محمد ہارون نے ادا کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ ہمارے بزرگ ناول نگاروں کے ناولوں نے ادبی دنیا میں اس قدر دھوم مچائی کہ نئی نسل بھی اردو ناول نگاری کی طرف سنجیدگی سے راغب ہوگئی۔ معروف فکشن نگار ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے کہا کہ اکیسویں صدی میں کافی تعداد میں ناول اور افسانوی مجموعے منظر عام پر آ رہے ہیں اور آج بھی اچھے ناول لکھے جا رہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 14 فروری 2025

بہار

اردو سمینار و مشاعرہ

آرہ: اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے، جسے پوری ریاست سمیت بھوجپور ضلع میں بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔ اسی ضمن میں آرہ کے ناگری پرچارنی ہال میں ضلع اردو زبان سیل کی جانب سے ضلع سطحی فروغ اردو سمینار و مشاعرہ و اردو عمل گاہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ نئی نسل میں اردو کے تئیں محبت اور جوش و جذبہ پیدا کرنے کے مقصد سے اسکول کے طلبا و طالبات کی تقریر کے علاوہ شہر کے کئی جانے مانے اردو اسکالر کے لیے بھی ایک حصہ مختص تھا جس کے تحت اردو زبان کی اہمیت پر مختلف مقررین نے تقاریر پیش کیں۔ اس موقعے پر ڈی ڈی سی ڈاکٹر انوپما سنگھ نے اردو کے حوالے سے اظہار خیال

کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان شیریں زبان ہے اور اس کی شاعری میں ہندو مسلم یکجہتی کے لیے اہم پیغام پوشیدہ ہوتا ہے۔

مہمان خصوصی کے خطبے کے بعد کاشف رضا، غلام رسول، صفی انور اور شمشاد عالم نے اردو سے متعلق اپنے مقالے پڑھے، جب کہ شاعر ذیشان بھاگلپوری، معین گریڈیہوی، شنکر کیموری، ڈاکٹر محمد شاہنواز، عالم نیاز اختر، آصف آروی، رشک بھوجپوری، حنا نسیم، عطاء الرحمٰن عطا، سلطان مظفر آزاد اور فاطمہ جبین نے کلام پیش کیے۔ اس کے بعد ضلع اردو نامہ نامی مجلّہ کا اجرا بھی کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اردو سیل کی نوڈل افسر اور ڈپٹی کلکٹر آسمہ خاتون نے کہا کہ اردو زبان کا مستقبل تابناک ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2025

عالمی یوم مادری زبان

پٹنہ: ''اردو مادری زبان کی حیثیت سے ہماری رگوں میں داخل ہے۔ اگر ہم اپنی ماں سے محبت کرتے ہیں تو

زبان سے محبت ہمارے خون میں شامل ہونا چاہیے، یہی ماں سے محبت کی دلیل ہے۔'' ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو میں منعقد یوم مادری زبان کی مناسبت سے منعقد کی گئی تقریب میں معروف استاد اور سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کیا۔

صدر شعبہ عربی ڈاکٹر سرور عالم نے زبان کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو ہماری تہذیب وتمدن کی زبان ہے۔'' معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر عطا عابدی نے کہا کہ اردو کے زوال کی ایک وجہ احساس کمتری ہے۔ انھوں نے طلبہ کو کہا کہ آپ احساس کمتری سے نکلیں اور فخر ومسرت کے ساتھ اس زبان کو ترقی کی بنیاد بنائیں۔ شاعر وادیب جناب ثناء اللہ دوگھروی نے کہا کہ انسان کے حافظہ اور تخلیقیت کے فروغ ونشونما میں ہماری مادری زبان سب سے زیادہ معاون ہوتی ہے۔

اس موقعے پر ایم اے سال اول ودوم کے طلبہ و طالبات نے بھی مادری زبان اردو کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں صدارت کے فرائض ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ادا کیے جبکہ نظامت واصف علی معظمی نے کی۔ اظہار تشکر کا فریضہ ڈاکٹر عشرت صبوحی نے انجام دیا۔ شعری نشست میں مہمانوں نے اردو کے موضوع پر اپنی نظمیں سنائیں اور اپنے غزلیہ کلام سے بھی نوازا۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں اساتذہ طلبہ وطالبات، ریسرچ اسکالرز اور عظیم آباد کے اہل علم نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی 23 فروری 2025

پنجاب

فرانسیسی زبان میں غالب، سودا اور منٹو کے ترجمے

چنڈی گڑھ: پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو میں 'فرانسیسی زبان میں غالب، سودا اور منٹو کے ترجمے' کے موضوع پر ایک خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر پیرس یونیورسٹی (فرانس) کے معروف ادیب، محقق، اور مترجم پروفیسر ایلن ڈیسولیئرز نے شرکت کرتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ کسی بھی ادب کی تکمیل شاعری، مصوری اور تصوف کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ غالب کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس قسم کے خیالات فرانسیسی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا کی شاعری میں تضحیک روزگار اور شہر آشوب کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، فرانسیسی اور ہسپانوی زبان میں بھی اسی نوع کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ منٹو کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ایلن نے کہا کہ انھوں نے 40 سے زائد منٹو کی کہانیوں کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرکے عوام کو اردو زبان و ادب سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس نے اپنے استقبالیہ خطاب میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو شعر و ادب کے ترجمے خواہ کسی بھی زبان میں کیے جائیں غالب کے بغیر نامکمل رہیں گے۔ شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں سے ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے بھی مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شعبے کی ادبی سرگرمیوں کو سراہا۔ پروگرام کے آخر میں شعبہ کے طلبہ وطالبات نے پروفیسر ایلن سے دلچسپ سوالات کیے، جن کے جوابات انھوں نے تفصیل سے دیے۔ اس تقریب کی نظامت شعبۂ اردو کے اسکالر خلیق الرحمٰن نے انجام دی، جب کہ اختتامیہ کلمات شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر ذوالفقار علی نے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 فروری 2025

تلنگانہ

تلنگانہ کا دکنی ادب

کنڈہ: محترمہ شوبھنا کامنینی اور جناب انیل کامنینی، ٹرسٹیز دومکنڈہ فورٹ وولیج ڈیولپمنٹ ٹرسٹ کی جانب سے دوم کنڈہ سمستھان کے راجہ راجیشور راؤ اصغر اور ان کے خاندان کی ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں ہر سال کی طرح اس سال بھی جشنِ اردو وسمپوزیم بعنوان 'تلنگانہ کا دکنی ادب' 22 فروری 2025 پنڈلی بھون قلعہ دوم کنڈہ میں عمل میں آیا اور والیانِ سمستھانِ دوم کنڈہ کی علمی ادبی، ثقافتی وتہذیبی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس سمپوزیم کے مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد سلیمان صدیقی سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے محترمہ اودیش رانی باوا ماہر دکنیات، محترمہ انورادھا ریڈی ماہر آثار قدیمہ، و کنوینز انٹیک چیاپٹر حیدرآباد و محترم سجاد شاہد کالم نگار و تاریخ داں نے شرکت کی۔ اس پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر عبدالقوی اسسٹنٹ پروفیسر وڈائریکٹر ایکول اپورچونیٹی سیل تلنگانہ یونیورسٹی تھے۔

سمپوزیم کا آغاز معززین نے شمع روشن کرتے ہوئے کیا۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عبدالقوی معاون اجلاس نے کی، پروفیسر محمد سلیمان صدیقی وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے اس سمپوزیم کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد دکن کے سمستھان، تہذیب، آرٹ، آرکیٹکچر اور دکنی زبان و ادب کے فروغ اور قومی یکجہتی امن و امان محبت و اخوت و بھائی چارگی کی بہترین مثال ہے۔

پروفیسر سلیمان صدیقی نے بتایا کہ راجہ راجیشور راؤ اصغر نے سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ انھوں نے تلنگانہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ پر زور دیا کہ وہ دوم کنڈہ کے تاریخی حقائق کو منظر عام پر لانے کے لیے تحقیق کروائیں تاکہ سمستھانوں کی رواداری سے

آج کل کی نوجوان نسل اور طلبا واقف ہوسکیں۔ مہمان اعزازی سید سجاد شاہد نے والی دوم کنڈہ راجہ راجیشور راؤ اصغر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شعری سرمایہ میں صرف ایک غزل ملی جو دلی سے منگوائی گئی۔ پوری غزل میں خدا کی وحدانیت کا بیان ہے۔ دوم کنڈہ سمستھان کے راجاؤں نے زبان، تہذیب و ثقافت، مقامی مذہبی قدروں اور شعری و نثری سرمایہ کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اس موقعے پر محترمہ انورادھا ریڈی، محترمہ اودیش رانی، جی وینکٹ سوامی دوم کنڈہ نے اظہار خیال کیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر محمد عبدالقوی پروگرام کوآرڈینیٹر نے جشنِ اردو سمپوزیم کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔

اس موقعے پر معروف شاعر و افسانہ نگار جناب قدیر دانش کی تصنیف 'کچھ فسانے دل کے' کی رسمِ اجرا پروفیسر محمد سلیمان صدیقی سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

سمپوزیم کا پہلا ادبی اجلاس بعنوان 'تلنگانہ کا دکنی ادب' کی صدارت ماہرِ آثارِ قدیمہ و کالم نویس سجاد شاہد نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد عبدالقوی نے انجام دیے۔ اس تکنیکی سیشن میں نو مقالے پڑھے گئے جن میں محترمہ اودیش رانی، ڈاکٹر نکہت آرا شاہین سابق پرنسپل اورینٹل اردو کالج حیدرآباد، پروفیسر عرشیہ جبین شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر گل رعنا ایسوسی ایٹ پروفیسر تلنگانہ یونیورسٹی، ڈاکٹر نشاط احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد کاشف اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، واحد نظام آبادی شاعر و ادیب اور ڈاکٹر رئیس فاطمہ اردو اسکالر و ادیبہ قابلِ ذکر ہیں۔

جناب سجاد شاہد صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مقالے پر مغز پیش کیے گئے، مقالہ نگاروں پر زور دیا کہ وہ اپنے مقالے میں تعارف چھوڑ کر اصل تحقیق کو پیش کریں اور تمہیدی کلمات سے اجتناب کریں اور کہا کہ دکنی ادب کے پس منظر میں سماج، تہذیب و ثقافت کو ملحوظ رکھیں۔ بعد ازاں منجیرا ڈگری کالج کاماریڈی کے طلبا و طالبات نے کچھ کلاسیکل شاعروں کی غزلیں اور نظموں کو ترنم اور تحت اللفظ پیش کیں۔ ڈاکٹر ثمینہ بیگم لکچرر ویمنس یونیورسٹی کوٹھی حیدرآباد نے حیدرآباد کے ڈھولک کے گیت کا تعارف پیش کیا جب کہ محترمہ سارہ بانو و ہمنوا نے ڈھولک کے گیت پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ محترم عتیق حسین خاں بندہ نوازی اور ہمنوا نے امیر خسرو، راجہ راجیشور راؤ اصغر، سعید شہیدی اور دیگر شعرا کے کلام پر قوالی پیش کرتے ہوئے سماں باندھ دیا۔ آخر میں بانجی اور ڈاکٹر عبدالقوی نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس امید کا اظہار کیا کہ آئندہ کے پروگراموں میں بھی اسی طرح کا تعاون جاری رہے گا۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، 25 فروری 2025

تمل ناڈو

اردو کے صرفی نظام پر خصوصی خطاب

چنئی: شعبہ اردو قائد ملت کالج، میڈواکم چنئی کے زیر اہتمام 'اردو کا صرفی نظام' کے موضوع پر ایک

خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیئرمین جناب ڈاکٹر امان اللہ ایم بی ریسورس پرسن کے طور پر موجود تھے۔ انھوں نے اردو صرفی نظام میں اس کے ساختی نمونوں اور لسانی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے قیمتی بصیرت فراہم کی۔ قائد ملت کالج دراصل ایک عام ڈگری کالج ہے جو میڈواکم، چنئی، تمل ناڈو میں واقع ہے۔ اس کالج میں دیگر زبانوں کے ساتھ عربی اور اردو کے شعبے بھی قائم ہیں۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا دکنی یا تمل آمیز اردو بولتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے اردو کے صرفی نظام سے متعلق تمل اور اردو دونوں زبانوں میں طلبا کی تفہیمی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے خطاب فرمایا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر نسرین بانو، ماڈواکم، 14 فروری 2025

کرناٹک

عصرِ حاضر میں کلامِ غالب کی معنویت

شیموگہ: کوئمپو یونیورسٹی، شیموگہ، کرناٹک میں 24 اور 25 فروری 2025 کو منعقدہ دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس

بعنوان 'عصرِ حاضر میں کلامِ غالب کی معنویت' میں شہر کڈپہ سے تین مقالہ نگار اور آندھرا پردیش سے کل آٹھ مقالہ نگاران کی نمائندگی قابلِ ستائش ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد کوئمپو یونیورسٹی شیموگہ نے کرناٹک اسٹیٹ اردو اکیڈمی بنگلور اور تنظیم فروغ اردو، چینائی کے اشتراک سے کیا۔ کانفرنس کا کلیدی خطبہ معروف ادیب و محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی نے آن لائن پیش کیا۔

کانفرنس کے ڈائریکٹر پروفیسر سید ثناء اللہ، پرنسپل سہیادری آرٹس کالج اور صدر شعبۂ اردو، کوئمپو یونیورسٹی رہے۔ دو روزہ کانفرنس کا افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شرت انت مورتی نے کیا۔ پہلی نشست کی صدارت پروفیسر محمد نثار احمد اور پروفیسر سید سجاد حسین نے کی۔ اس کانفرنس کی پہلی نشست میں ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری اور ڈ محمد نقی اللہ خان نے اپنے مقالات پیش کیے۔

آن لائن نشستوں میں انور ہادی جنیدی، ڈاکٹر ظہیر دانش عمری، ڈاکٹر محمد فیض اللہ، ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری، کوشلیا دیوی وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ کانفرنس کی آن لائن نشستوں کی نگرانی ڈاکٹر تمیم احمد قاسمی نے کی اور تکنیکی ذمے داری ڈاکٹر عرفات حسین شاہ نے بحسن و خوبی انجام دی۔ اس کانفرنس کے مقالات کا مجموعہ تقریباً 400 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اجرا کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں وائس چانسلر اور دیگر معززین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: انور ہادی، شیموگہ، 25 فروری 2025

مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کمپیوٹر سینٹر میں یوم مادری زبان

مالیگاؤں: الفت سوشل ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر انصرام جاری آئی ٹیک کمپیوٹر سینٹر جو کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نئی دہلی (NCPUL) اور این آئی ای ایل آئی ٹی (NIELIT) کے اشتراک سے جاری ہے۔ 21 فروری 2025 بروز

جمعہ کو ایک تقریب بنام یومِ مادری زبان محترم رضوان سر کی صدارت میں رکھی گئی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پرایڈوکیٹ مفتی محمد طفیل قاسمی کو مدعو کیا گیا۔ اغراض و مقاصد محترمہ عائشہ نے پیش کیے۔ سینٹر کے طلبہ وطالبات نے یومِ مادری زبان کے پُرمسرت موقعے پر زبان کی تاریخ وتوسیع ،اور زبان کے قواعد کے مختلف جز کو پیش کیا۔ زبان کی تعمیر وترقی میں سرکردہ شخصیات جیسے میر تقی میر، امیر خسرو، مولانا الطاف حسین حالی، ڈاکٹر علامہ اقبال، بہادر شاہ ظفر جیسی کئی شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ ہندوستان کے آئین کی روشنی میں زبان کے حقوق کی معلومات دی گئی۔ سینٹر کی طالبات نے نظم، نثر، افسانہ، ناول، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مرثیہ وغیرہ پیش کیے۔ مفتی محمد طفیل قاسمی نے زبان کی ترقی وبقا کے لیے اٹھائے جانے والے اقدام اور ہماری ذمہ داری کو سمجھایا۔ آخر میں ریحان کے رسمِ شکریہ پر اس تقریب کا اختتام ہوا۔ جبکہ اس تقریب کی نظامت سینٹر کی طالبہ الفیہ نے بحسن خوبی انجام دی۔

پریس ریلیز: لیک کمپیوٹر سینٹر، 25 فروری 2025

اردو فکشن اور ہندوستانی سماج

چھترپتی سمبھاجی نگر اورنگ آباد): شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، چھترپتی

سمبھاجی نگر (اورنگ آباد) میں ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو فکشن اور ہندوستانی سماج' کا انعقاد بتاریخ 27 فروری عمل میں آیا۔ اس قومی سمینار کا کلیدی خطبہ پروفیسر صغیر افراہیم، سابق پروفیسر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آن لائن پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ جدید فکشن نگار جو 1980 کے بعد کے ہیں ان کی تخلیق میں بیانیہ انداز زیادہ نظر آ رہا ہے اور جدید فکشن نگار سماجی نقطۂ نظر کے مطابق اپنے موضوعات کو منتخب کر رہے ہیں۔ مہمان خصوصی معروف اردو ادیب نور الحسنین نے نے کہا کہ ادیب سماج میں جو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے اسے اپنے تاثرات کے ساتھ ادبی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ بعد ازاں مہمان اعزازی پروفیسر محمد غیاث الدین نے سمینار کے موضوع پر اپنے زرین خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج تک سماج کے بغیر فکشن کا وجود ممکن نہیں ہوا ہے اسی طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بنا سماج کے کہانی کا موضوع ناممکن ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدر ڈاکٹر ویشالی کھاپڑے (ڈین فیکلٹی آف انٹر ڈسپلینری اسٹڈیز) ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی) نے سمینار کا افتتاح کیا اور ایک روزہ قومی سمینار سے متعلق اپنے خیالات بیان کیے۔ اسی طرح سمینار کی صدر پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے (صدر شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی) نے پروگرام کی غرض و غایت بتائی اور تمام مہمانان و حاضرین کے لیے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شیخ اصغر (اسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ڈاکٹر بامو) نے بحسن وخوبی انجام دی جبکہ ڈاکٹر رضوانہ رہبر (اسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ڈاکٹر بامو) کے شکریے پر افتتاحی اجلاس اختتام کو پہنچا۔ پہلے ٹیکنکل اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر بیگ مرزا سابقہ پرنسپل چشتیہ کالج خلد آباد، ڈاکٹر عتیق احمد قریشی، صدر شعبہ اردو بدنا پور کالج، پروفیسر مسعود انصاری، صدر شعبہ اردو انکوش راد ٹوپے کالج جالنہ نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر یاسمین میڈیم، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج اورنگ آباد و دیگر اساتذہ کرام و ریسرچ اسکالرس نے جملہ چھ مقالے پیش کیے جس میں آن لائن مقالے بھی پڑھے گئے۔ نظامت ایم اے سال اول کی طالبہ خان شفا مسرور نے کی جبکہ شکریہ خان ترانہ نے ادا کیا۔ اجلاس دوم میں چار مقالے پیش کیے گئے جبکہ اس کی صدارت پروفیسر سلیم محی الدین اور آصف زکریا، پرنسپل چشتیہ کالج خلد آباد نے کی۔ نظامت ایم اے سال دوم کی طالبہ عظمیٰ فہیم اور شکریہ عائشہ پروین نے کیا۔ تیسرے ٹیکنکل اجلاس میں کالجز کے اساتذہ اور دیگر یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس نے بہترین انداز میں مقالے پیش کیے۔ اجلاس کی صدارت معروف اردو ادیب نور الحسنین اور پروفیسر محمد غیاث الدین نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر کیرتی مالینی و ٹھل راؤ جاولے نے کی۔ اجلاس میں موجود اندرون و بیرون ریاست سے آئے مہمانان اور صدور اجلاس نور الحسنین، پروفیسر محمد غیاث الدین، پروفیسر سلیم محی الدین، پروفیسر آصف زکریا نے سمینار سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ نظامت ایم اے سال دوم کی طالبہ زورین صدف نے کی جبکہ شکریہ کے کلمات ریسرچ اسکالر شیخ اظہر بشیر نے ادا کیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر سہیل ہاشمی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، 6 مارچ 2025

اردو شاعری کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد

مراٹھواڑہ: شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو شاعری کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد' کا انعقاد 8 فروری 2025 کو ہوا۔ اس قومی سمینار کے کلیدی خطبہ کے لیے پروفیسر خواجہ اکرام الدین شعبہ اردو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو شاعری نے ہر عہد کی نمائندگی کی ہے اور آئندہ مستقبل میں بھی کرتی رہے گی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر انور الدین (صدر شعبہ اردو ڈگری ویمن کالج حیدرآباد) بھی موجود تھے۔ انھوں نے بھی اپنے خطاب میں اردو شاعری کے بدلتے رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر سلیم محی الدین (صدر شعبہ اردو ڈاکٹر رفیق ذکریہ کالج فار ویمن) نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا اس کے علاوہ ڈاکٹر اودیش رانی باوا (اردو کی معروف اسکالر) حیدرآباد سے مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائی تھیں انھوں نے بھی موضوع سے متعلق پر مغز گفتگو کی۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر سنجے بی سالونکے (ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی) نے سمینار کا افتتاح کیا اور اردو شاعری اور اس سمینار کے متعلق اپنے خیالات و تاثرات کو پیش کیا۔ اسی طرح سمینار کی صدر پروفیسر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاولے (صدر شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی) نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کیا۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر شیخ اصغر اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو نے سمینار کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور اس اجلاس کی نظامت کو بخوبی انجام دیا۔ جبکہ

ڈاکٹر سید سہیل احمد ہاشمی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو کے شکریے پر افتتاحی اجلاس کا اختتام ہوا۔

اسی طرح پہلے ٹیکنیکل اجلاس کے صدارت پروفیسر آصف ذکریہ (پرنسپل چشتیہ کالج خلد آباد) اور ڈاکٹر عتیق احمد قریشی (صدر شعبہ اردو بدنا پور کالج، ضلع جالنہ) نے کی، اس اجلاس میں پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ایم اے سال دوم کی طالبہ زورین صدف نے کی اور شکریے کے کلمات ایم اے سال اول کی طالبہ عنیزہ بیگم نے ادا کیے۔ دوسرے ٹیکنیکل اجلاس میں دیگر کالج سے آئے ہوئے اساتذہ کرام نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور پروفیسر سلیم محی الدین نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شیخ اصغر نے کی اور شکریہ کے کلمات ایم اے سال دوم کی طالبہ سیدہ افشین آرا نے ادا کیے۔ اسی طرح سے تیسرے ٹیکنیکل اجلاس میں بیرون ریاست سے آئے ہوئے اور دیگر کالج سے آئے ہوئے مقالہ نگاروں نے اپنے پرمغز مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر جاوید اقبال (صدر شعبہ اردو شیواجی کالج ہنگولی) اور ڈاکٹر انورلدین (صدر شعبہ اردو ڈگری ویمن کالج حیدرآباد) نے اور ڈاکٹر اودیش رانی باوا نے انجام دیے۔ جبکہ نظامت ایم اے سال اول کے طالب شیخ عتیق نور نے کی اور تمام مقالہ نگاروں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اختتامی اجلاس پروفیسر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاؤلے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں انھوں نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس میں اندرون ریاست اور بیرون ریاست سے آئے ہوئے مہمان پروفیسر خواجہ اکرام الدین' ڈاکٹر انورالدین' پروفیسر سلیم محی الدین' ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی، پروفیسر جاوید اقبال نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے اور کامیاب سمینار کے انعقاد پر شعبہ اردو کی روح رواں پروفیسر کیرتی مالنی وٹھل راؤ جاؤلے کو مبارکباد دی اور اپنے نیک خیالات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس کی نظامت شعبہ اردو کی استاد ڈاکٹر رضوانہ رہبر نے کی۔ جبکہ شکریہ کے کلمات پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر شیخ اظہر بیشتر نے پیش کیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر شیخ اصغر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ، یونیورسٹی، اورنگ آباد، 6 مارچ 2025

اعزاز و اکرام

اخلاق احمد آہن

نئی دھلی: فارسی ایکشن فاؤنڈیشن لندن (برطانیہ) کی طرف سے یونیورسٹی آف ویسٹ منسٹر، ہاروہال، لندن میں عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے فارسی زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے کی گئی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر اخلاق آہن کو قند پارسی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فارسی ایکشن فاؤنڈیشن، برطانیہ میں موجود فارسی زبان تارکین وطن کے ذریعے قائم کردہ ایک فعال ادبی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم، فارسی زبان و ادب اور ثقافت کے عالمی فروغ کے لیے باقاعدگی سے ہر سال، مختلف مناسبتوں سے ادبی محافل، علمی تقریبات اور ثقافتی تقریبات کا انعقاد کرتی ہے۔ مذکورہ تنظیم، فارسی زبان، ادب اور تہذیب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرنے والے محققین کو عالمی مادری زبان کے دن قند پارسی ایوارڈ سے نوازتی ہے۔ اس سال دسویں عظیم الشان کانفرنس کے موقعے پر اس ایوارڈ کے لیے پروفیسر اخلاق آہن کا انتخاب کیا گیا اور ایک خوبصورت تقریب میں انھیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ ایران کے ایک اور محقق ڈاکٹر علی رضا قیامتی کو بھی یہ ایوارڈ دیا گیا۔ مذکورہ کانفرنس میں افغانستان، ایران اور سمرقند کے فنکاروں کے ذریعے ایک خوبصورت موسیقی پروگرام پیش کیا گیا۔ اس دوران یونیورسٹی ہال میں کتابوں، ملبوسات اور دستکاریوں کی نمائش بھی لگائی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دادخدای قدم زادہ، آقا خان انسٹی ٹیوٹ، لندن نے فارسی زبان کی تاریخی پیش رفت و فروغ میں ہخامنشی، ساسانی اور سامانی سلطنتوں کے کردار پر روشنی ڈالی۔ سابقہ بی بی سی صحافی نجیبہ کسرائی نے شاہنامہ فردوسی کے تراجم پہ بات کی اور کہا کہ شاہنامہ، ایران کے تمام خطوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر موسیقی اور رقص کے دوران، معروف افغانی مزاحیہ شاعر اور صحافی ہارون یوسفی نے اشعار پیش کیے۔ اخلاق آہن جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبہ فارسی سے بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ وابستہ ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 فروری 2025

ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی

سردھانا: اردو زبان و ادب کی ترویج میں خصوصی خدمات انجام دینے والے معروف شاعر اور ادیب

ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کو 'احسان دانش کاندھلوی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز انھیں اردو بیداری فورم مظفرنگر کے زیراہتمام ایک خصوصی پروگرام کے دوران پیش کیا گیا۔ یہ عظیم الشان پروگرام تسمیہ جونیئر ہائی اسکول، مظفرنگر میں منعقد کیا گیا، جس کا مرکزی موضوع تھا 'مادری زبان کی اہمیت اور ہماری ذمے داری' اس تقریب کا مقصد اردو زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور لوگوں کو اس کی ترویج و اشاعت سے آگاہ کرنا تھا۔ انجمن اتر پردیش کے کنوینر صابر خان جب کہ بہار کے گروگوبند ڈگری کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شہاب الدین مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد مستمر، ڈاکٹر ابراہیم افسر اور ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت معروف ادیب الطاف مشعل اور محمد ارشاد نے مشترکہ طور پر کی۔ اردو زبان و ادب کی خدمت میں نمایاں خدمات انجام دینے والی چار شخصیات کو یادگاری نشانات سے نوازا گیا۔ اسی سلسلے میں سردھانہ کے نامور ادیب ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کو احسان دانش کاندھلوی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی شاعری اور ادب کے میدان میں پہلے بھی کئی باوقار ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کتابوں اور مضامین نے اردو ادب میں ایک اہم مقام بنایا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 فروری 2025

رضوان علی

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے زیراہتمام 38 ویں آل انڈیا فارسی ٹیچرس ایسوسی ایشن کانفرنس منعقد کی گئی جس کا موضوع 'دہلی میں فارسی زبان و ادب اور تہذیب کی وراثت' تھا۔ اجلاس میں ایرانی سفیر ڈاکٹر ایرج الٰہی اور ایرانی پارلیمنٹ کے سابق اسپیکر ڈاکٹر غلام علی حداد عادل نے خصوصی شرکت کی۔ مقررین نے ہندوستان اور ایران کے گہرے ثقافتی و ادبی تعلقات اور فارسی زبان کے فروغ پر زور دیا۔ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف نے ہندوستان میں فارسی زبان کے تاریخی اثرات کو اجاگر کرتے ہوئے طلبہ کو فارسی ادب کے مطالعے کی ترغیب دی۔ اس موقعے پر تحقیقی مجلّہ 'دارادر پن' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ کانفرنس میں معروف دانشوروں کے ہاتھوں زبان فارسی کے لیے کام کرنے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی دوران ایران کے سابق اسپیکر ڈاکٹر غلام علی حداد عادل کے ہاتھوں معروف مخطوطہ شناس رضوان علی کو فارسی مخطوطات کی شناخت کے اعتراف میں 'سعدی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ بتادیں کہ رضوان علی نے 2019 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے فارسی زبان میں ماسٹرز مکمل کیا اور اس وقت انٹرنیشنل نور مائیکرو فلم سینٹر دہلی میں مخطوطہ شناس اور فہرست نویسی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کانفرنس کے اختتام پر صدر شعبۂ فارسی پروفیسر کلیم اصغر نے تمام مہمانوں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سمیت دیگر معاونین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 فروری 2025

صغیر اشرف

دھرہ دون / دیوبند: ڈاکٹر صغیر اشرف کو پروفیسر عنوان چشتی ایوارڈ سے نوازتے ہوئے اتراکھنڈ کے وزیر اعلیٰ پشکر سنگھ دھامی نے کہا کہ زبانیں سماج کا

آئینہ ہوتی ہیں، دستور ہند میں شامل تمام بھارتیہ بھاشائیں ہماری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب کی عزت اس زبان کے تمام لوگوں کی عزت ہوتی ہے، بھاشا سنستھان کے وزیر شری سبودھ انیال نے کہا کہ اردو سمیت ساری زبانیں ہماری ہیں اور ہم ان کے ساتھ انصاف کریں گے۔ خزان سنگھ ایم ایل اے نے کہا کہ ہم تمام بھاشاؤں کی حفاظت کریں گے، سنستھان کی ڈائرکٹر سواتی بھدوریا نے کہا کہ ہمیں زبانوں کے ذریعے تہذیب ملتی ہے۔ اس لیے ہم زبانوں کی حفاظت اور فروغ کے لیے کمربستہ ہیں۔ سنسکرت یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر انشارانی پانڈے نے کہا کہ زبان تحفہ خداوندی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ ایک لاکھ 51 ہزار روپیہ نقد اور سند توصیف پر مشتمل ہوتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2025

تحقیق، تعلیم اور ادب سے وابستہ شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا

نوگانواں سادات / امروھه: قصبہ نوگانواں سادات میں وزڈم گیٹ وے فاؤنڈیشن کے زیراہتمام ایک تقریب میں تعلیم، تحقیق اور ادب کی دنیا کی نامور شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ مایا شنکر یادو اور سب ضلع مجسٹریٹ برج پال سنگھ مہمان خصوصی تھے۔ دونوں افسران نے ماہرین ادب و تحقیق کو یہ ایوارڈز پیش کیے۔ اس موقعے پر معروف ماہر ارضیات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ارضیات کے سابق سربراہ پروفیسر محشر رضا کو کرشنن آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سال کا یہ ایوارڈ بھی مشترکہ طور پر معروف وکیل سریندر کمار شرما اور محشر رضا کو دیا گیا جنھوں نے انگریزی زبان کی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب کہ شاعر گوہر نقوی کو ان کی ادبی خدمات پر نیر مسعود اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب میں شہرت انٹر کالج کے پرنسپل مرحوم سرفراز حسین کی یاد میں جاری ایوارڈ ان کے بیٹے کو دیا گیا۔ دوسری جانب ماسٹر شبیہ حیدر بابر کو تعلیمی میدان میں زندگی بھر خدمات سرانجام دینے پر گریٹیو ایوارڈ دیا گیا۔ اے ڈی ایم مایا شنکر یادو نے اپنے خطاب میں تعلیم کو بااختیار بنانے کا بہترین ذریعہ بتایا۔ اے ڈی ایم نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ تعلیمی میدان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ ایس ڈی ایم برج پال سنگھ نے اپنے خطاب میں تعلیمی بہتری کی طرف سفر میں صبر اور لگن کی ضرورت پر زور دیا۔ وزڈم گیٹ وے فاؤنڈیشن کے چیئرمین علی عمران نے کہا کہ ان شخصیات نے اپنی کامیابیوں سے پورے خطے کا نام روشن کیا ہے۔ ایسی شخصیات کو اعزاز دے کر تنظیم خطے کے نوجوانوں کو ترغیب دینا چاہتی ہے تاکہ وہ ترقی یافتہ اور خود انحصار ہندوستان کے سفر میں فعال طور پر تعاون دے سکیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مارچ 2025

واجد اختر صدیقی

گلبرگہ: محمد جاوید اقبال صدیقی کی اطلاع کے بہ موجب بہ روز ہفتہ 15 فروری سہ پہر مہاتما گاندھی ہال میں گلبرگہ یونیورسٹی کے زیراہتمام کرناٹک راجیہ اتسو ایوارڈ

تقسیم انعامات کی ایک عظیم الشان تقریب بہ صدارت پروفیسر جی راملو وائس چانسلر گلبرگہ یونیورسٹی منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا افتتاح پروفیسر ملے پورم ریزیڈنٹ وائس چانسلر کرناٹک سنسکرت یونیورسٹی بنگلورو نے شمع افروزی کے ذریعے کیا۔ ہر سال گلبرگہ یونیورسٹی علاقہ کلیان کرناٹک سے وابستہ کنڑ اور دیگر زبانوں کے شعرا و ادبا کی شائع شدہ کتابوں پر کرناٹک راجیہ اتسو ایوارڈ سے نوازتی ہے۔ اس سال بھی سال 2023 میں شائع شدہ کتابوں پر جملہ 34 شعرا و ادبا کی کتابوں کے مصنفین کو اس تقریب میں پروفیسر ای ٹی پٹیار ریزیڈنٹ وائس چانسلر گلبرگہ یونیورسٹی نے کرناٹک راجیہ اتسو ایوارڈ سے نوازا۔ اس تقریب میں اردو کے واحد معروف قلمکار و شاعر واجد اختر صدیقی کو کرناٹک راجیہ اتسو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی کتاب 'نقش تحریر' کے لیے دیا گیا۔ یہ ایوارڈ مومنٹو شال اور سند کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ کیسہ زر پر مشتمل ہے۔ واضح ہو کہ واجد اختر صدیقی

کی جملہ پانچ کتابیں شائع ہوکر کافی مقبول ہوچکی ہیں، نقش تحریران دنوں ملکی سطح پر اپنی شناخت بنا رہی ہے۔ مہاتما گاندھی ہال میں سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 16 فروری 2025

تقریب تقسیم ایوارڈ

گاندھی نگر: 21 فروری 2025 کو گاندھی نگر، گجرات، میں گجرات کے وزیراعلیٰ جناب بھوپیندر بھائی پٹیل کی صدارت میں تقسیم ایوارڈ کی ایک رنگارنگ اور شاندار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں گجراتی اور کچھی کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اردو کے چار سینئر اور معمر شعرا و ادبا کو ساہتیہ گورو پرسکار برائے اردو اور اردو کے ایک یوا (نوجوان) شاعر کو یوا گورو پرسکار برائے اردو سے نوازا گیا۔ سینئر ادبا و شعرا کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(1) پروفیسر مقصود احمد (برائے 2020)
(2) جناب ریاض لطیف (برائے 2021)
(3) جناب شفاعت قادری (برائے 2022)
(4) جناب ستین دیسائی (برائے 2023)

اور نوجوان شاعر کا نام نامی حسب ذیل ہے:

(1) جناب سفیان صادق پٹھان (برائے 2022)

معمر شعرا و ادبا کو مومنٹو، سند اور شال سے سرفراز کیا گیا اور اس کے ساتھ انھیں ایک لاکھ روپے کا چیک بھی عطا کیا گیا جب کہ نوجوان شاعر کو مومنٹو، سند شال اور 50000 کے چیک سے نوازا گیا۔

ڈاک سے: پروفیسر مقصود احمد، 3 مارچ 2025

رسم اجرا

نقد ونظر

نئی دهلی: ''جلال الدین اسلم صحافت و کتابت کا بہترین امتزاج ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی قلم و

قرطاس کی خدمت میں بسر کی اور آج پیرانہ سالی کے باوجود بھی قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ قائم ہے۔'' ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے جلال الدین اسلم کے منتخب مجموعہ مضامین 'نقد و نظر' کے اجرا کی تقریب میں کیا۔ ممتاز صحافی معصوم مرادآبادی نے خطاب میں کہا کہ جلال الدین اسلم کی تازہ کتاب میں شامل مضامین ملک و ملت کے لیے ان کے درد کو اجاگر کرتے ہیں۔ سینئر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ جلال الدین اسلم نے کتابت اور صحافت کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال نے کہا کہ 'نقد و نظر' جلال الدین اسلم کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے گہری سوچ کے بعد لکھے ہیں۔ پروگرام کے آرگنائزر اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ جلال الدین اسلم نے گوشہ نشینی کے ساتھ اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ بڑے بڑے ادیبوں اور صحافیوں نے انجام نہیں دی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اس موقعے پر صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ان مضامین کو بھی منظر عام پر لائیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 21 فروری 2025

غالب اور ترقی پسند تنقید

نئی دهلی: ترقی پسندوں نے غالب کو جاگیردارانہ

معاشرے کی پیداوار بتایا تھا مگر فاروق بخشی نے یہ کتاب مرتب کرکے ترقی پسندوں اور غالب کے رشتے کو نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ جہاں غالب شناسی کی جانب ایک قدم ہے وہیں پروفیسر بخشی کی ژرف بینی اور ان کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر عبدالحق نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ یہ تقریب پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی سرپرستی میں عمل میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ میں فاروق بخشی کو طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں وہ بے انتہا ذہین اور محنت کش انسان ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کی تدوین ایسا شخص ہی کرسکتا ہے۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سینئر پروفیسر پروفیسر محمد زماں آزردہ نے شرکت کی۔ انھوں نے پروفیسر فاروق بخشی سے اپنے دیرینہ مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ جہاں بھی رہے کوٹہ، اودے پور اور حیدرآباد ہر جگہ انھوں نے اردو کا پرچم سربلند رکھا۔ پروفیسر خالد علوی نے کہا کہ فاروق بخشی نے اس کتاب میں ترقی پسند نقادوں کے ساتھ ساتھ دوسرے نقطۂ نظر کے نقادوں کے خیالات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ پروفیسر خالد اشرف نے کہا کہ پروفیسر فاروق بخشی اپنے نظریات پر عمل پیرا رہنے والے انسان ہیں۔ یہ کتاب 'غالب اور ترقی پسند تنقید' ان کے انھی خیالات کی عکاس ہے۔ اس ادبی تقریب میں مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے جنرل جاوید اقبال نے کہا کہ 'غالب اور ترقی پسند تنقید' جیسی وقیع کتاب مرتب کرکے فاروق بخشی نے غالب شناسی کا ایک منفرد باب وا کیا ہے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر ابراہیم افسر اور ڈاکٹر محمد عمران عاکف خان نے تبصراتی مضامین پیش کیے۔ اظہار تشکر کرتے ہوئے صاحب تصنیف پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ اس تقریب کی کامیابی کا سہرا پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس کے سر ہے۔ اس تقریب میں بڑی تعداد میں دانشگاہوں کے طلبہ اساتذہ اور دانشور موجود تھے۔ تقریب کی نظامت معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2025

اچھے دن کا سوگ

نئی دهلی: قطر میں مقیم معروف شاعر عتیق انظر کے شعری مجموعے 'اچھے دن کا سوگ' پر مذاکرہ اور محفل شعر و سخن کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ نگر کے ہوٹل ریورویو میں

منعقد پروگرام کی صدارت الحاج عقیل بخش نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خالد محمود نے شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر ہدئی زری والا جلوہ افروز تھیں۔ اس موقعے پر جن حضرات نے مجموعۂ کلام 'اچھے دن کا سوگ' پر اظہار خیال کیا، ان میں پروفیسر خالد محمود، معین شاداب، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر خان رضوان وغیرہ شامل تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ عتیق انظر کی نظموں کا اسلوب تمثیلی اور استعاراتی ہے۔ شاعر معین شاداب نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مزاحمتی شاعری کرنے کی جسارت وہی شخص کرسکتا ہے جو حساس دل، انسان دوست، امن پسند اور محب وطن ہو۔ عتیق انظر ان تمام خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ اس موقعے پر محفل شعر وسخن کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی نظامت پروفیسر رحمان مصور نے کی۔ مختلف شعراء کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2025

کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: پریس کلب آف انڈیا میں لٹریری فیسٹیول اور کتاب میلے کا آغاز ہوا، جس میں کلب کے سرکردہ ممبران کی کتابوں کا اجرا اور ان پر مباحثہ بھی ہوا۔ اس موقعے پر ہندی اور انگریزی صحافیوں کی کتابوں کے ساتھ معروف اردو صحافی معصوم مرادآبادی کی کتاب 'جی ڈی چندن (مونوگراف)'، سہیل انجم کی کتاب 'اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات' اور خاتون صحافی اور بلاگر روہنی سنگھ کی کتاب 'اردو میں میرا دوسرا جنم' کا اجرا عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2025

تمل ترجمہ دیوان غالب

شعبۂ عربی فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام مکمل تمل ترجمہ دیوان غالب کا اجرا عمل میں

آیا۔ ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے دیوان غالب (غالب کوی دیگل) کا تعارف کرایا۔ تمل کے معروف شاعر و ادیب جناب کوی اروی تی۔ مو۔ عبدالقادر نے دیوان غالب کی رسم رونمائی کرتے ہوئے کہا کہ غالب کا تمل ترجمہ جب ہاتھ میں آیا تو غالب کی شاعری نے مجھے مطالعہ کرنے پر آمادہ کردیا۔ اس موقعے پر کوی اروی عبدالقادر، ڈاکٹر ذاکر حسین، تمل فلمی گیت نگار جناب کادل مدھی (قادر محی الدین)، ڈاکٹر جی۔ پلنی، ڈائرکٹر، مرینا کیمپس نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اختتام میں مترجم غالب ڈاکٹر سید رفیق باشاہ حسینی نے اپنے تاثراتی خطاب میں شعبہ عربی، فارسی و اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ غالب کو میں تقریباً 20 سال سے تمل میں ترجمہ کرنے کی کوشش میں رہا۔ اس کوشش کے نتیجے میں غالب کے کلام کے تمل میں 7 طرز کے میں نے ترجمے کردیے پھر بھی ترجمہ سے متفق نہیں ہوا آخرکار یہ ترجمہ میں نے حتی الامکان غالب کو تمل قالب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرا میں شعبہ تمل سمیت دیگر شعبہ جات کے طلبا کثیر تعداد میں موجود رہے۔

پریس ریلیز: نسرین بانو، شعبۂ عربی فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی، 5 مارچ 2025

غالب: اعظم شعراء الہند

نئی دھلی: اردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی اور شاعری پر عربی زبان میں پہلی کتاب 'غالب: اعظم شعراء الہند یعنی غالب، ہندوستان کا سب سے بڑے شاعر' کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انڈیا-عرب کلچرل سینٹر میں ہوا۔ پروفیسر حبیب اللہ خان نے کہا کہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر ظفرالاسلام خان اعلیٰ درجے کے مترجم اور اسکالر ہیں۔ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے کہا کہ اشعار کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ڈاکٹر ظفرالاسلام کے پاس اس کام کو انجام دینے کے لیے ضروری استعداد اور تجربہ موجود ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے کہا کہ ان کا جامعہ کے شعبۂ عربی سے دیرینہ تعلق ہے۔ انھوں نے بتایا کہ غالب پر مضامین مصر کے اعلیٰ ادبی جریدہ المجلۃ اور قاہرہ ریڈیو کے البرنامج الثانی کے لیے بیسویں صدی کے چھٹی دہائی کے اواخر میں لکھے تھے جب وہ قاہرہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے اسی وقت یہ کتاب بھی لکھی تھی، لیکن کسی طرح یہ اب جاکر شائع ہورہی ہے۔ تقریب کے صدر شعبۂ عربی، جامعہ پروفیسر نسیم اختر نے کہا کہ شعبہ اس اہم کتاب کے اجرا پر فخر محسوس کرتا ہے، جو غالب پر عربی زبان میں پہلی کتاب ہے۔ غالب کی شاعری میں ایک انفرادیت ہے۔ ان کے خیالات روایتی ہوسکتے ہیں لیکن ان کے اظہار کی خوبصورتی بے نظیر ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2025

آئندہ

نئی دھلی: عالمی کتاب میلہ 2025 ہال نمبر 2 میں ریختہ کے اسٹال نمبر آر 37 پر سلیم محی الدین کی کتاب (آئندہ) شعری مجموعہ کی رونمائی عمل میں آئی۔ معزز حضرات میں شامل محمد تقی، ڈاکٹر پروفیسر ریاض عمر، شفیع ایوب، شمس اقبال (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان زبان)، سالم سلیم، فیصل و دیگر پروقار شخصیات موجود رہیں۔ سلیم محی الدین کی یہ دوسری کتاب ہے، اس سے پہلے 'وابستہ' شائع ہوئی تھی۔ وابستہ سے آئندہ تک کا آپ کے سفر کے ذہنی وفکری شعری وفنی ارتقا کا سفر ہے جو خوشگوار بھی ہے اور روح افزا بھی۔ آپ کی شاعری عصری آگہی کا وہ منظرنامہ ہے جو قارئین کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس موقعے پر ریاض عمر، محمد تقی شمس اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 فروری 2025

نقوش ادب

مظفرپور: انجمن ندائے ادب کے زیر اہتمام اسلم رحمانی کی تصنیف 'نقوش ادب' نامی کتاب کا اجرا شہر کے ایک ہوٹل میں ایک تقریب کے دوران ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے کہا کہ میری تدریسی زندگی تقریباً چالیس سال پر محیط ہے۔ ان چالیس برسوں میں ایسا پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ بی اے کے طالب علم کے قلم سے اتنی معیاری کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے سابق چیئرمین امتیاز احمد کریمی نے اسلم رحمانی کو کتاب کی اشاعت اور اجرا کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے پروگرام میں موجود طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی عظمت کی کلید علم ہے۔

آپ محنت اور ایمانداری سے پڑھیں اور ملک وقوم کو نفع پہنچانے والے بنیں۔ ایس ایم اشرف فرید نے کہا کہ اگر جذبے میں صداقت اور عزم مصمم ہو تو منزلیں خود ہی بڑھ کر قدموں کا بوسہ لیتی ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے بہار قانون ساز کونسل کے رکن قاری صہیب نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے۔ انھوں نے نقوش ادب کی اشاعت پر کتاب کے مصنف اسلم رحمانی کو مبارکباد پیش کی۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق پرووائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم نے کہا کہ اسلم رحمانی کی زبان بہت ہی صاف ستھری ہے۔ معروف صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ مظفرپور تحریک کی سرزمین ہے۔ استقبالیہ کلمات کامران غنی صبا نے پیش کیے۔ انجینئر ظفر اعظم کے شکریے کے ساتھ یہ یادگار تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ نظامت جمیل اختر شفیق نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2025

گنجینہ

بھرائچ: آج کی نئی نسل اردو زبان وادب کے تئیں بڑی فعال اور متحرک ہے، جس سے لگتا ہے کہ اردو زبان نہ مٹی ہے اور نہ کبھی مٹے گی۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر محمد عثمان صدر شعبۂ بی ایڈ کسان ڈگری کالج بہرائچ نے شعری مجموعہ 'گنجینہ' کی رسم اجرا کی تقریب میں کیا۔ واضح رہے کہ شہر کی معروف ادبی شخصیت محمد جمال اظہر صدیقی اور ان کی تین بہنوں کا مشترکہ شعری مجموعہ 'گنجینہ' منظر عام پر آیا، جس کی رسم اجرا کی پروقار تقریب انجمن فروغ ادب کے زیر اہتمام شہر کے محلہ محمد نگر کالونی میں معروف شاعر مظہر سعید علیگ بہرائچی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر سفیان احمد انصاری نے جمال اظہر صدیقی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ معروف اردو اسکالر شفیق احمد باغبان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بہرائچ کی ادبی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ تقریب کے دو سیشن تھے، پہلے سیشن میں شعری مجموعہ گنجینہ کی رسم اجرا اور دوسرے سیشن میں شعری نشست منعقد ہوئی، جس میں درجنوں شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 فروری 2025

تیرونشتر

سلطانپور: جاہل سلطانپوری کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری پڑھنے سے یہ بات بخوبی ذہن نشیں ہوتی ہے کہ وہ صرف لفظ و بیان اور ذہنوں کو جھنجھوڑنے والی شاعری نہیں کرتے بلکہ سماج و معاشرے کی ناہمواریوں کو پیش کرتے ہوئے عوام کو سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر خالد قادری سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے دریاپور واقع عبدالکریم ایڈوکیٹ کی قیام گاہ پر طنز ومزاح استاد و بزرگ شاعر جاہل سلطانپوری کے مجموعہ کلام تیرونشتر کی رسم اجرا کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کیا۔ اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے عبدالکریم ایڈوکیٹ نے تفصیل سے جاہل سلطانپوری کے فن و شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شاہنواز عالم اسسٹنٹ پروفیسر اردو جی ایس پی جی کالج سلطانپور نے کہا کہ جاہل سلطانپوری نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں موضوعات کے وسیع کینوس پر کئی رنگ بکھیرے ہیں۔ ڈاکٹر نیاز سلطانپوری نے کہا کہ جاہل اصلاً اودھی کے کوی ہیں لیکن وقتاً فوقتاً منھ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو زبان میں بھی اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد شعری نشست ہوئی جس کی نظامت عاقل سلطانپوری نے کی۔ اس شعری نشست میں شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔ پرویز کریم نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 فروری 2025

خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام عالمی کتاب میلے میں مختلف کتابوں کا اجرا

نئی دہلی: خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام عالمی کتاب میلے میں مختلف کتابوں کی رسم اجرا تقریب عمل میں آئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) کے ڈائرکٹر یوراج ملک، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اقتدار احمد خان نے شرکت کی۔ پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم کی تحقیق کردہ کتاب 'مذاہب عالم میں انصاف کا تصور'، محمد علی شاہ کی 'سارا سنسار ایک پریوار'، ڈاکٹر محمد معروف شاہ کی کتاب 'مسلم وومین مینی فیسٹو فار چینج' کا اجرا عمل میں آیا۔ 'سارا سنسار ایک پریوار' بچوں کی کہانیوں پر مبنی ہے، جو ملک وسماج کو جوڑنے کی بات کرتی ہے۔ کتاب 'مسلم وومین مینی فیسٹو فار چینج' مسلم خواتین کے حقوق پر مبنی ہے، اس میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام نے خواتین کو بہت سے حقوق فراہم کیے ہیں، لیکن یہ حقوق سماج ان کو نہیں دیتا ہے۔ 'مذاہب عالم میں انصاف کا تصور' کو تین زبانوں ہندی، اردو اور انگریزی میں شائع کی ہے۔ کتابوں کے اجرا کے بعد سبھی کتابوں پر مذاکرہ کا انعقاد بھی کیا گیا، جس کے تحت 'مسلم وومین مینی فیسٹو فار چینج' پر کتب کے مصنف ڈاکٹر معروف شاہ اور پروفیسر سید مبین زہرا نے گفتگو کی۔ 'مذاہب عالم میں انصاف کا تصور' پر کتاب کے مصنف پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم اور پروفیسر اقتدار محمد خان نے گفتگو کی جب کہ 'سارا سنسار ایک پریوار' پر اس کے مصنف محمد علی شاہ اور یوراج ملک نے گفتگو کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال اور یوراج ملک نے کہا کہ تینوں کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں، اس کے لیے ہم تمام مصنفین کو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ سبھی کتابیں قارئین کو کافی پسند آئیں گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 فروری 2025

پیام تعلیم

نئی دہلی: جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول میں ہر سال کی طرح امسال بھی سالانہ تقریب کا انعقاد بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر محمد ارشد خان نے کہا کہ ہمارے اسکول کے بچوں میں زمانے کے شانہ بشانہ چلنے اور ہر میدان میں اپنا پرچم لہرانے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کی اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر مظہر آصف (شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) شریک رہے۔ انھوں نے جامعہ اسکول کے بچوں کی کارکردگیوں اور ان کی فتوحات پر نہ صرف خوشی ومسرت اور فخر وانبساط کا اظہار کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ شیخ الجامعہ کے دست مبارک سے سالانہ اسکول میگزین 'پیام تعلیم' اور پرنسپل ڈاکٹر محمد ارشد خان کی ایک کتاب 'ہندوستانی معاشرے پر فیروز شاہ کے انتظامی ومعاشی نظام کے اثرات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 فروری 2025

ظ۔ ایک شخص تھا

نئی دھلی: پرگتی میدان میں جاری عالمی کتاب میلے میں ایم آر پبلی کیشن دہلی کے اسٹال پر، بمبئی سے تشریف لائے معروف شاعر وصحافی جناب ندیم صدیقی کی نئی کتاب 'ظ ایک شخص تھا' کی رونمائی سہارا چینل اردو کے انچارج و ادیب جناب لائق رضوی کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ تقریب کے منتظم معروف شاعر اور اتراکھنڈ اردو اکادمی کے سابق نائب صدر جناب افضل منگلوری نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر معروف صحافی جناب حسن ضیا، معصوم مراد آبادی، معروف شاعر وصحافی شعیب رضا فاطمی، معین شاداب، انجم جعفری، بنارس کے مشہور شاعر شری کیشو شرن، شری ونئے مشرا، شاعر اسلم جاوید، عارف دہلوی، جاوید علی، اردو بک ریویو کے ایڈیٹر عارف اقبال، کاتب و اردو اکادمی کے رکن جناب محسن الحق نے کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے ظ انصاری اور ندیم صدیقی کی صحافتی خدمات کا ذکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 فروری 2025

نئی فکریات اور گوپی چند نارنگ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے آج اردو زبان و

ادب کی ممتاز ادبی شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے 95ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ڈاکٹر مشتاق صدف کی تازہ تصنیف 'نئی فکریات اور گوپی چند نارنگ' کا اجرا کیا۔ پروفیسر نعیمہ خاتون نے مصنف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ گوپی چند نارنگ جیسی عبقری شخصیت کے انتقال کے ڈھائی سال بعد ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مشتمل مشتاق صدف کی یہ مکمل کتاب خراج عقیدت کے ساتھ خراج تحسین بھی ہے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف بھی۔ ہمارے لیے یہ باعث افتخار ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے 2014 میں ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری اور 2016 میں سرسید ایکسیلنس ایوارڈ سے نوازا تھا۔

سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین اور ممتاز نقاد پروفیسر شافع قدوائی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مشتاق صدف کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے میں نارنگ صاحب کا اساسی کردار رہا ہے۔ صدر شعبۂ اردو اور معروف ادیب پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ مشتاق صدف نے اپنی کتاب میں گوپی چند نارنگ کی علمی و ادبی، لسانی، تحقیقی اور تنقیدی اکتسابات کو بڑی جگرکاوی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے یونیورسٹی میں علمی ماحول کو مستحکم کرنے کے لیے وائس چانسلر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2025

شمیم طارق شخصیت اور علمی وادبی فتوحات

پونے: انجمن محبان ادب پونہ کی جانب سے شائع کردہ پروفیسر معین الدین خان فلاحی کی مرتب کی ہوئی کتاب

'شمیم طارق شخصیت اور علمی وادبی فتوحات' اجرا کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول صاحب نے کہا کی اس کتاب میں یوں تو سب کچھ اچھا ہے مگر انتساب پڑھ کر صرف شمیم طارق صاحب کی شخصیت ذہن میں ابھرتی ہے۔ آج اردو دنیا میں باصلاحیت، بے غرض اور مخلص شخصیات بھی چند ہی ہیں۔ شمیم طارق کی حیثیت مستثنیات میں سے ہے۔ وہ شاعر، کالم نگار، محقق، نقاد، بافیض اور خوبصورت طرز نگارش کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے مقرر ہیں، یہ ان کا امتیاز ہے۔ مدیر انقلاب شاہد لطیف صاحب مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے شمیم طارق صاحب کی شخصیت اور علمی فتوحات پر سیر حاصل گفتگو کی جس کے ہر جملے پر خوب داد و تحسین ملی اور انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ شمیم طارق صاحب سے محبت وعقیدت کا تقاضہ ہے کہ ان کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ 8 فروری 2025 کی شب میں وائی ایم سی اے ہال پونے میں انجمن محبان ادب پونہ کی جانب سے منعقدہ تقریب رسم اجرا کی صدارت پروفیسر آفتاب انور شیخ (پرنسپل چوائس کالج وارجے پونہ وسابق پرنسپل پونا کالج) نے کی اور کہا کہ بیشک پروفیسر معین الدین خان فلاحی کی کتاب میں وہ مقالات شامل ہیں جو پونا کالج میں منعقدہ سمینار میں پڑھے گئے تھے مگر ان مقالات اور تقاریر کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے زمانے میں کئی اچھی روایتیں قائم ہوئیں جس میں سے ایک شمیم طارق صاحب پر منعقدہ قومی سمینار بھی ہے۔ انھوں نے شمیم طارق صاحب کی شخصیت اور قلندرانہ اوصاف پر بھی روشنی ڈالی۔ پروفیسر معین الدین فلاحی نے کہا کہ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ میں نے سیمینار یا کتاب کے لیے شمیم طارق صاحب کا ہی کیوں انتخاب کیا؟ تو عرض ہے کہ میرے ذہن میں ان کا یہ جملہ گونج رہا ہے کی مجھے اتنی ہی اردو آتی ہے جتنی میری ماں نے پڑھائی تھی۔ اردو میرے لیے مادری زبان بھی ہے اور مادری تہذیب بھی۔ اس کے علاوہ شمیم طارق صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات میں ایسی جامعیت ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں ہے۔ شمیم طارق صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے واضح کیا کہ سمینار کے انعقاد یا کتاب کے اجرا میں میری گزارش یا سفارش شامل نہیں ہے یہ پروفیسر معین الدین فلاحی کا فیصلہ تھا۔ ان کو جامعۃ الفلاح سے بھی ایک تہذیب ملی ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی۔ وہ دونوں تہذیبوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ پروفیسر معین الدین فلاحی صاحب نے مجھ جیسے گمنام شخص پر قومی سمینار کا انعقاد اور کتاب شائع کرکے ایک ناقابل فراموش کارنامہ

انجام دیا ہے جس کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جلسے میں بحیثیت مہمان اعزازی جناب شاہنواز تھانہ والا صاحب اور محترمہ خواجہ کوثر حیات صاحبہ نے بھی تقریریں کیں۔ جلسے کی نظامت مولانا سمیع احمد فلاحی نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اس تقریب رونمائی میں اتنی زیادہ تعداد میں اہل علم جمع ہوئے کہ ہال اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتا ہوا نظر آیا۔ کتاب کے مرتب پروفیسر معین الدین خان فلاحی نے پراثر لفظوں میں شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی کامیابی میں انجمن محبان ادب پونہ کے فعال کارکنان مولوی معاذ قاسمی، مولوی توحید، مولوی شجاعت ندوی، انجنیئر ساجد انصاری اور انجنیئر تنزیل باسم کا بھی اہم رول رہا۔

پریس ریلیز: انجمن محبان ادب، پونہ، 12 مارچ 2025

ڈاکٹر سیفی سرونجی کی چھ نئی کتابوں کی تقریب رونمائی

سرونج: مشہور شاعر و ادیب سہ ماہی 'انتساب' کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی 6 نئی کتابوں کا اجرا سیفی لائبریری میں کیا گیا جن میں گاؤں سے شہر تک (شعری مجموعہ)، تنقیدی رنگ (نثر)، سرحد پار (مضامین)، اردو رسائل کی ادبی خدمات (تذکرے)، سیفی سرونجی کے سو تبصرے اور 'موضوعاتی نظمیں' شامل ہیں۔ انتساب پبلی کیشنز اور سدبھاؤنا منچ کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب دو اجلاس پر مشتمل تھی۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ 'سیفی کی یہ کتابیں تو اپنی اہمیت رکھتی ہی ہیں لیکن ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لیے دو کتابوں کا تذکرہ لازمی ہوگا۔ پہلی ان کی آپ بیتی 'یہ تو سچا قصہ ہے' اور دوسرا سفرنامہ 'سرونج سے لندن تک'۔ پہلی کتاب کے متعلق نصرت ظہیر نے کہا تھا کہ یہ گاندھی جی کی 'تلاش حق' کے بعد دوسری ایسی آپ بیتی ہے جس میں اس قدر حق گوئی سے کام لیا گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے کے بعد سیفی کا سفرنامہ دوسرا ایسا سفرنامہ ہے جس میں دروغ گوئی کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ پروفیسر عزیز اللہ شیرانی نے کہا کہ سیفی کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ فرحان حنیف وارثی نے سیفی سرونجی کو ادب کا ایک ایسا مسافر قرار دیا جو منزل پر پہنچنے کے بعد بھی رکتا نہیں ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت اقبال مسعود نے کی اور کہا ''سیفی بنیادی طور پر محنت کش انسان ہیں اور یہ محنت کش زندگی کے ہر موڑ پر اپنی محنت سے کھڑا ہے۔ ایم ڈبلو انصاری (سابق آئی پی ایس) نے ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ''عام طور سے لکھنے والے پوری زندگی میں بھی چھ کتابیں نہیں لکھ پاتے اور سیفی سرونجی کی ایک ساتھ چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔'' ڈاکٹر ذکی طارق نے 'گاؤں سے شہر تک' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''زندگی کی بے شمار صعوبتوں کے بعد انھوں نے گاؤں سے شہر تک کا طویل سفر طے کیا ہے۔'' ان کے علاوہ شاہد حبیب، ظفر سرونجی، سید عروج احمد اور اسعد ہاشمی نے بھی اظہار خیال کیا۔ تقریب کی نظامت استوتی اگروال نے کی۔ آخر میں سدبھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2025

وفیات

شعور اعظمی

ممبئی: ممتاز شاعر اہل بیت، زبان و عروض کے استاد (ہجری سنہ کے مطابق 71 سالہ) ڈاکٹر شعور اعظمی 26 فروری کی شام نواح ممبئی 'ممبرا' میں انتقال کر گئے۔

ممبئی میں دور گزشتہ کے ممتاز سینئر شاعر اور اردو کے مشہور استاد مہدی اعظمی (مرحوم) کے فرزند اکبر جن کا خاندانی نام 'سید قاسم مہدی' عرف ڈاکٹر شعور اعظمی 1957 میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر شعور کا آبائی وطن اعظم گڑھ (اترپردیش) کا موضع چماواں تھا، لیکن ان کی پیدائش نہال احد پور میں ہوئی تھی۔ انھوں نے طبیہ کالج (ممبئی) سے کی طبی تعلیم پائی اور علاج و معالجے کے شعبے سے متعلق ہوئے۔ ڈاکٹر شعور اعظمی ایک طویل مدت سے گوونڈی میں مطب کیا کرتے تھے۔ مرحوم نے ممبرا رہائش اختیار کرلی تھی اور آج نواح ممبئی کے اسی ٹاؤن (ممبرا) میں وہ آسودۂ خاک ہوئے۔ ڈاکٹر شعور اعظمی ذیابیطس اور مثانے (پروسٹیٹ) کے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ شام ممبرا کے ایم ایم ویلی کے علاقے میں واقع شیعہ قبرستان میں جسد خاکی شعور کو سپرد لحد کیا گیا۔ ان کی کئی کتابیں شعر و ادب کے ماہرین سے داد پا چکی ہیں۔ عروض و قوافی سے متعلق ان کی ایک کتاب 'فرہنگ شعور' جامعہ ممبئی کے نصاب میں شامل ہے۔ شعور عروض، شعور مدحت اور شعور مودت شائع ہو چکی ہیں جبکہ 'شعور ولایت'، شعور حسینیت، شعور حجت (اہل بیت کی مدحت مع مختصر سوانح) زیر طبع ہیں، اسی کے ساتھ وہ ان دنوں 'شعور اللغات' پر کام کر رہے تھے۔

پریس ریلیز: ندیم صدیقی، ممبئی، 12 مارچ 2025

سرور نگینوی

نئی دہلی: 6 مارچ معروف شاعر و صحافی سرور نگینوی ولدیت حاجی عبدالرشید انصاری، کا دہلی اربن اسپتال میں دوران علاج 79 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

ان کے انتقال کی خبر سے حلقہ احباب اور شعرا میں غم کا ماحول چھا گیا، آپ دہلی اردو اکادمی کے مشاعرے نئے پرانے چراغ اور اتر پردیش کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ نگینہ ضلع بجنور اتر پردیش سے تعلق رکھنے والے سرور نگینوی اہل دہلی کے درمیان دہلی شہر کے باشندوں کی طرح گھلے ملے رہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن میں بکھرا بکھرا لہجہ، سہرے کا پھول، کلیات فروغ نگینوی، اور زیر ترتیب مسودہ آبلے پھوٹ پڑے شامل ہیں۔ سرور نگینوی کی تحریریں ملک کے مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ شعری و ادبی خدمات پر آپ کو عبدالرزاق انصاری ایوارڈ برائے شاعری سال 2017 رانچی جھارکھنڈ، علامہ اقبال ایوارڈ برائے شاعری اتر پردیش سال 2014 سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 6 مارچ 2025

محمد عارف نگرامی

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلما کے سابق شیخ التفسیر

مولانا محمد اویس نگرامی کے بیٹے اور معروف صحافی محمد عارف نگرامی کا علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً 72 سال تھی، پسماندگان میں دو بیٹے عبداللہ انیس نگرامی اور علی انیس نگرامی ہیں۔ ان کی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں بعد نماز ظہر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی قیادت میں ادا کی گئی اور عیش باغ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم محمد عارف نگرامی بلند شخصیت کے مالک تھے۔ مرحوم نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما سے حاصل کی جب کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی سے استفادہ کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے سعودی عرب میں نیشنل کمرشیل بینک میں ملازمت کی۔ وہ انڈین کونسلیٹ جدہ سے بھی وابستہ رہے۔ وطن واپسی پر لکھنؤ سے ایک اخبار شائع کیا اور اخیر تک اس کے مدیر اعلیٰ رہے۔ شہر اور بیرون شہر کئی سماجی و تعلیمی تنظیموں سے بھی وابستہ تھے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا شہر کے علمی و سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 فروری 2025

راشد طراز

نئی دہلی/مونگیر: اردو کے معروف شاعر پروفیسر راشد طراز کا 4 مارچ 2025 کو انتقال ہوگیا۔ ان کا

تعلق مونگیر کے دلاور پور سے تھا۔ موصوف شہر کے آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج سے برسوں وابستہ رہے۔ مونگیر کے مشہور کالج سے سبکدوشی کے بعد مسلسل علالت سے دوچار رہے۔

پروفیسر راشد طراز ایک بہترین شاعر کے طور پر اپنی شناخت بھی رکھتے تھے۔ مونگیر کی معروف ادبی انجمن 'اردو فورم' کے بینر تلے منعقد ہونے والی ادبی تقریب میں موصوف نہ صرف یہ کہ شرکت کرتے بلکہ اپنے کلام کے ذریعہ حاضرین کو محظوظ بھی کراتے۔ پروفیسر راشد طراز کے کئی مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آئے، جنھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بطور خاص 'شہر منافق'، 'کاسہ شب'، 'ستارہ شکستہ'، 'غبار آشنا'، 'گردش ناتمام'، 'جہاں تک روشنی ہوگی' اور 'صبح ازل' نامی ان کے شعری مجموعوں کو ادب نواز حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ہندوستان ایکسپریس نیوز بیورو، 6 مارچ 2025

خالد قمر بچھرایونی

نئی دہلی: اپنے عہد کے معروف و مقبول شاعر خالد قمر بچھرایونی کا طویل علالت کے بعد 13 مارچ 2025 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے ہیں۔ وہ طویل عرصے سے نوئیڈا میں مقیم تھے۔ ان کی تدفین شاہین باغ قبرستان میں عمل میں آئی۔ وہ ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کا شمار مشاعروں کے کامیاب شاعروں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے کئی کامیاب اور تاریخ ساز مشاعرے بھی منعقد کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مارچ 2025

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

عالمی اردو کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल–2025,वर्ष:27, अंक:04
URDU DUNIYA Monthly, April-2025, Vol.27, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/03/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6